سلسلہ کلام اساتذۂ اردو

نمبر ۳

انتخاب

مثنویاتِ میرؔ

مع تمہید و مقدمہ

مرتبہ
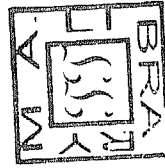
آنریبل جسٹس ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان نائٹ ایم اے ایل ایل ڈی بیرسٹر ایٹ لا

جج ہائی کورٹ الہ آباد

(محمد احید الدین ایف آر ایس اے پرنٹر)

مطبوعہ نظامی پریس بدایون

بار اول

سنہ ۱۹۳۰ء

فہرست تصحیح اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
مقدمہ ۹	۶	شبہ کیا۔ اب اٹھئے	"شبہ کیا" کے بعد ڈیش علامتِ ختم فقرہ سے قبل یہ اضافہ کرلیا جائے "میر کا خود شعر ہے ۔۔۔ کیا چمار کہتا ہے؟
مقدمہ ۱۳	۶	زبان مکان	زمان ومکان
″ ۱۴	۱۷	نواب آصف الدولہ	نواب آصف الدولہ
″ ۱۸	۱	اسنادی	اُستادی
″ ۲۰	۱۴	ابہام بھی نہیں	ابہام بھی نہیں
″ ۲۷	۱۶	ہمیں دُنیا سے	ہمیں دنیا سے
″ ۲۸	۱۲	جو دربار کے لیے	جو قصائد کے لیے

اغلاط انتخاب مثنویات میر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۳	نیرنگ سازی	نیرنگ سازی
۷	۵	کہاں ہی تو	کہاں ہے تو
۷	۹	نازپرورومہر...	نازپرورد...دیکھتی
۸	فٹ نوٹ ۲	۵۲ فائدہ لیا گیا۔ وجہ مفاد	۵۲ حاصل
۱۰	۱۹	کٹی بے وطن	کٹی بے وطن
۱۱	۱۴	پلا ساقی	پلا ساقی
۱۵	۲۰	غمزہ وخشم	غمزۂ خشم
۱۷	۱۵	بے جاں وہ	بے جان وہ
″	۱۷	در پے امتحاں	در پے امتحاں
۲۰	۶	منتعل	مشتعل
۲۱	۱	دریائے عسق	دریائے عشق
″	۵	جنوں	جنون
″	۸	زخم تر کے بیج	زخم تر کے بیچ
۲۲	۳	ایک	اک
″	۱۲	عشق یکّا	عشق یکّا
″	فٹ نوٹ ۲	۵ بمعنی یکتا	۵۲ بمعنی یکتا
۲۳	۱	دیکھتے ہیں کے	دیکھتے اس کے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۴	۶	جان تمناکش	جاں تمناکش	۶۲	۲۰	توخوشی جی	توخوش جی
۲۷	۹	نازوخوبی	نازوخوبی	۶۳	۲	چمن میں	چمن میں
//	۱۰	تلطف	تلطّف	//	۳	گل بداماں	گل بداماں
//	۱۱	ذخار	زخار	۶۴	۳	شگوں	شگوں
۳۱	۱۹	ایک آفت	اک آفت	//	۸	خوبیٔ خرام	خوبیِ خرام
۳۲	۵	خوں رواں	خون رواں	۶۶	۲	کباب ہیے	کباب رہیے
//	۱۹	خون باری سے	خوں باری سے	//	۱۶	بے ہودہ	بیہودہ
۳۳	۱۵	وردوزباں	وردِ زباں	۶۷	۲۲ فٹ نوٹ	لہ کوچ کا نقارہ بجا	لہ کوچ کا نقارہ بجا ہے
//	۱۸	ہرایک کا	ہراک کا				
//	فٹ نوٹ ۲۱	سہ دل مرا سہ چاک چاک	سہ دل مرا سہ چاک سہ چاک	۶۹	۱۳	لہ بیماری سے صحت	لہ بیماری سے صحت بحالی
۳۷	۱۷	کبوترجوں سے	کبوتر خوں سے	۷۲	۷	نوئی	لوئی
۳۹	۱۳	خرابے	خرابے	//	۱۱	پردہ ہی گا	پردہ رہے گا
۴۰	۳	جنوں	جنوں	//	۱۸	ڈھیری	ڈھیری
//	۱۰	گے خوش	گئے خوش	۷۳	۳	ایوان	ایواں
۵۱	۲	بیڑہ پان کو	بیڑہ پاں کو	۷۴	۱	ہیچ کوئی	ہیچ کوئی
//	۷	جنوں کا آسیب	جنون کا آسیب	//	۱	فندکروں	فند کروں
//	۱۶	لچلے	لچکے	//	۷	بوریہ	بوریا
۵۳	۱۰	سری خبطی	سڑی خبطی	۷۵	۱۴	یاروں کا	یاروں کو
۵۶	۱۳	کوئی پاس	کوئی پاس	//	۲۰	درکا !	درکا
۶۱	۱۳	خواب کراں	خواب گراں	۷۷	۱	ایوان	ایواں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۸	۲	(۷۸)	(۱۳)
″	۲۰	پیے گئے ہیں	لے گئے ہیں
۸۰	۹	نجی لطمی	لُجّہ لطمی ۵
۸۱	۵	طلاطم	تلاطم
۸۳	۴	یا د دے	یاد دے
″	″	سرودستوں کو	سرو و مستوں کو
″	۱۴	لعل ناب وۂ گہر	لعل ناب و گہر
″	۱۸	پلٹن	پلٹنیں
۸۵	۳	خرد و پیر	خورد و پیر
″	۲۰	عیان	عیاں
″	۲۱ فٹ نوٹ	۱ بلند	۱ چرخ اثیر معنی چرخ بلند
″	″	۳ دوم دار	۳ دُم دار
۸۷	۵	جہاں کہن	جہانِ کہن
″	۱۷	چنیں و چناں	چنین و چناں
۸۸	۲	جرم	خرّم
″	۱۱	ایک و ودرم	اک دو دم
″	۱۹	شیر زیاں	شیر ژیاں
۹۲	۷	طلاطم	تلاطم
۹۳	۱۲	شیر غریں	شیر عریں
۹۴	۸	ارتب	ارنب
″	۹	الٹنی گئی	اُلٹی گئی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹۵	۱۵	جبل سے بُلند	جبل سے بلند
۹۸	۷	جنسا	جیسا
″	۱۹	صدا	سدا
۱۰۱	۵	گزار ہوا	گزارا ہوا
۱۰۲	۸	سوئر بن	سور بن
۱۰۳	۱۰	رونق پزیر	رونق پذیر
۱۰۷	۷	دھنے لگے	دھننے لگے
۱۰۹	۱۴	۲ غلاظت کے کیڑے	۳ گھورے ۔ کوڑے کے کیڑے
۱۱۰	۹	پکس ہیں	پھکیں ہیں
۱۱۴	۱۷	فائنہ	فائزہ
۱۱۵	۲۰	گبر	گبر ۶
۱۱۹	۱۵	جانؔ	جاں
۱۲۱	۱۰	بنیہ	بنیا
″	۱۸	وہ منی دنگ	دہ منی دیگ
″	۲۰	وہ بلاغ	جو وہ بلاغ
۱۲۳	۱۰	سجے	سمجھے
۱۲۵	۱۵	اٹھائیے	اٹھائے
″	″	آئیے	آئے
۱۲۸	۳	د۶و	د۲و
۱۳۰	۶	جلدی مں	جلدی ہیں

سبب انتخاب

مقدمہ لکھنے سے پہلے تمہید کے طور پر میں سطور ذیل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے میر ایسے اُستاد کی مثنویات میں سے انتخاب کی جرأت کیوں ہوئی اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا ہے کہ میر نے وہ زمانہ پایا تھا جب کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے فحش مضامین یا الفاظ کا اشعار میں قلمبند ہو جانا کچھ بھی معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ بعض قصّے ایسے بھی نظم کیے ہیں جو موجودہ زمانہ میں مغربی خیالات کے اصحاب کی نگاہ میں سخت قابل اعتراض ہیں اُن فحش خیالات یا غیر فطری حکایات کو ان کی اصلی صورت میں شایع کرنا بالکل نازیبا ہے۔ اور غیر پاکیزہ تصوّرات کی اشاعت ہرگز شایاں نہیں یہ پڑھنے والے کے دل میں میر کی عظمت کو گھٹاتی اور اخلاق کے رشتے سے ان کے کلام کو گرا دیتی ہے۔ لہٰذا یہ مناسب خیال کیا گیا کہ اکثر اشعار اس طرح پر چھوڑ دیئے جائیں کہ مثنوی کا لطف بھی ہاتھ سے نہ جائے اور اصل قصّہ کی صورت بھی بدلی ہوئی معلوم نہ ہو۔ مگر یہ اُمید کرنا کہ اس کوشش میں پوری کامیابی حاصل ہوگی ممکن نہیں ہے۔

دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ میر کا کلام کثیر ہے۔ ماشاء اللہ طویل عمر پائی تھی اور ہمیشہ نظم لکھتے رہے۔ اس لیے کلام کا مجموعہ ضخیم ہو گیا مثنویات کا ذخیرہ بھی کافی طویل ہے۔ ان کی زندگی میں غالب کے دیوان کی طرح سے ان کے کلام کا کوئی انتخاب نہیں ہوا۔ ہر قسم کے اشعار بھرے ہیں۔ بقول آزاد ان کے کلام میں رطب و یابس سب کچھ ہے آزردہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ

"پستیش بغایت پست و بلندیش بغایت بلند است"

چنانچہ مثنویات میں بھی ہر قسم کے اعلیٰ، ادنیٰ اشعار موجود ہیں۔ اس لیے انتخاب ناموزوں نہ تھا۔ اصول انتخاب یہ رکھا گیا ہے کہ صرف اُن اشعار کو نقل کیا جائے جو فن شاعری کے نقطۂ نظر سے

قابل قدر ہیں جو محض بھرتی کے اور پھیکے اشعار تھے انھیں نکال دیا گیا ہے۔ فحش اشعار بھی ترک کر دیئے گئے ہیں۔ افسوس کہ ایسی صورت میں دو یا تین مثنویوں کے سوا، دیگر مثنویات کے پورے قصے پیش نہ کیے جا سکے مگر چونکہ اصلی غرض، عمدہ کلام کے شایع کرنے کی تھی نہ کہ صرف کہانیاں اور وہ بھی خصوصاً ایسی کہانیاں جن سے کوئی اچھا اخلاقی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اس لیے اس خامی کو گوارا کیا گیا۔

معذرت چونکہ اکثر مصنفین نے میر کے حالات پر بہت کچھ لکھا ہے اور نکتہ چینی کی ہے۔ اس لیے اب اس کا موقع نہیں رہا کہ کوئی نئی بات پیدا کی جائے۔ صرف میر کے والد کا نام محمد علی ہونا اور میر کی پیدائش کا اصلی سال ۱۱۳۶ھ ہونا، اور مطبوعہ نسخہ ذکر میر میں بہت کچھ تاریخی حالات کا ہونا، جو کہ میر کے آخری حالات زندگی اور آخر قطعہ تاریخ کے کئی سال بعد درج کیے گئے ہیں اور اب تک کسی مطبوعہ کتاب میں نظر سے نہیں گزرے، ان باتوں کے علاوہ کسی خاص نئی بات کے دریافت کرنے کے دعوے کی جرأت نہیں کی گئی ہے۔ کلیات میں سے چند نئے اشعار کا تلاش کر لینا، جن سے میر کے مزاج کا اندازہ ہو سکے یا ان کی زندگی کے کسی پہلو پر روشنی پڑے نئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اور نہ صرف معلوم باتوں کو دوسری ترتیب یا دوسرے الفاظ میں ادا کرنا کوئی غیر معمولی امر ہے۔

البتہ آج کل چونکہ یہ رواج ہو چلا ہے کہ مولانا آزاد کے اکثر منقولات پر اعتراض کیا جائے۔ ان کو غلط بتایا جائے اور ان پر یہ الزام لگایا جائے کہ اُنھوں نے من گڑھت قصے درج کیے ہیں اور ان پر اکثر مواقع میں نہ صرف مبالغہ بلکہ افترا پردازی کی تہمت بھی لگائی گئی ہے۔ تاکہ میر جیسے بڑے اُستاد کو غلیق منکسر المزاج ثابت کیا جائے۔ کیونکہ یہ باتیں ایک بڑے مسلم الثبوت اُستاد شاعر کے خلاف ہوتی ہیں حالانکہ بڑے سے بڑے اُستاد کے حالات کے متعلق بھی انصاف شرط ہے۔

اس لیے میں نے یہ ضرور کوشش کی ہے کہ ان الزامات کو از سر نو جانچوں اور اگر بے جا ہوں تو دور کروں۔

جو احسانات آزاد نے تاریخ ادب اُردو پر کیے ہیں ان سے زبان اُردو کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اور محض یہ وجہ کہ کچھ باتیں جو اُنھوں نے لکھی ہیں وہ ایک مسلم الثبوت بڑے شاعر کے خلاف ہوتی ہیں۔ ان کو غلط یا بے بنیاد قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آزاد نے اپنی رنگیں بیانی سے قصوں میں نمک مرچ لگایا ہے۔ لیکن ان میں سے

اکثر باتوں کو بے بنیاد کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے آزاد پر جو بے جا حملے کیے گئے ہیں، اس دیباچے میں ان کے رفع کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور جا بجا حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔

اعتراف مجھے خود اعتراف ہے کہ اس دیباچہ میں کسی جدّت یا نئی بات کے دریافت کرنے کا دعویٰ نہیں کیا گیا ہے۔ مشہور و معروف باتوں کا دوسرے الفاظ میں، نئی ترتیب سے اظہار کیا گیا ہے۔ اور جہاں کہیں کسی سابق نکتہ چین سے اختلاف کی جرأت کی گئی ہے، اسی موقع پر اس گستاخی کا اعتراف بھی کر لیا گیا ہے چونکہ تاریخی واقعات اور تنقیدی رائے کا ہر موقع پر حوالہ دینا ناممکن تھا اس لیے یہ فروگذاشت قابل نظرانداز ہے۔

واقعات کے زیادہ حصے مولانا آزاد کی بیش بہا کتاب آبِ حیات سے ماخوذ ہیں۔ جس کا پورا اقرار کیا جاتا ہے۔ اکثر مضامین دیگر تصانیف پر مبنی ہیں، جس کی تفصیل ہر مقام پر امکان سے باہر تھی اس لیے ان کتابوں کی مختصر فہرست درج کی جاتی ہے۔ چونکہ حال کی کتابوں کے اکثر واقعات آبِ حیات سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے ان کے مکرر اعتراف کی چنداں ضرورت نہ رہی

فہرست تصانیف

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف
۱	آبِ حیات	محمد حسین آزاد (طبع اول)
۲	ذکرِ میر	میر تقی مع مقدمہ مولوی عبدالحق
۳	نکات الشعراء	میر تقی مع دیباچہ نوشتہ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
۴	تذکرہ شعرائے اُردو	میر حسن دہلوی
۵	گلشنِ ہند	میرزا علی لطف
۶	مخزنِ نکات	قیام الدین قائم چاندپوری
۷	سخن شعراء	عبدالغفور خاں نسّاخ
۸	تذکرہ شمیم سخن	مولوی عبدالحی صفا بدایونی
۹	گلشن بیخار	محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف
۱۰	سراپا سخن	سید محسن علی محسن
۱۱	چمنستان شعراء	رائے لچھمی نراین شفیق
۱۲	تذکرہ مراۃ الخیال	اصل کتاب دستیاب نہ ہو سکی۔
۱۳	گل رعنا	مولوی عبدالحیٔ (ناظم ندوۃ العلما)
۱۴	شعر الہند	مولوی عبدالسلام ندوی
۱۵	انتخاب کلام میر	مولوی عبدالحق
۱۶	تاریخ ادب[1] اردو	مرزا محمد عسکری
۱۷	گلزار سخن	جگناتھ پرشاد فیض
۱۸	مقدمہ دیوان حالی	مولانا الطاف حسین حالی
۱۹	نیرنگ خیال	میر نمبر رسالہ نیرنگ خیال
۲۰	گلزار ابراہیمی	
۲۱	تذکرہ شورش	یہ کتابیں دستیاب نہ ہو سکیں
۲۲	بہار بے خزاں	
۲۳	تذکرۃ الخواتین	مولوی عبدالباری

[1] تاریخ ادب اردو بابو رام سکسینہ کی کتاب ہسٹری آف اردو لٹریچر کا اردو ترجمہ ہے جو مرزا محمد عسکری صاحب نے کیا ہے لیکن میر کے حالات کے متعلق اصل متن سے ترجمہ میں بہت زیادہ لکھا ہے۔ اسی لیے ترجمہ کا حوالہ دیا گیا۔

مقدمہ

تاریخی حالات

خاندان و ولادت میر محمد تقی میر کی پیدایش اکبرآباد (آگرہ) میں ہوئی۔ بقول آزاد[۱] ان کے والد کا نام میر عبداللہ تھا۔ گلزار ابراہیمی میں بھی میر عبداللہ ہی لکھا ہے۔ لیکن کسی اور قدیم تذکرہ میں اس نام کا پتہ نہیں چلتا۔ مولوی عبدالحق[۲] کے خیال میں اصلی نام علی متقی تھا۔ لیکن میری رائے میں ان کا اصلی نام محمد علی تھا اور پرہیزگار درویش ہونے کی وجہ سے اُن کا لقب علی متقی ہوا۔ میں اس کے ثبوت میں ذکر میر کی دو عبارتوں پر استدلال کرتا ہوں جو نظرانداز کی گئی ہیں۔ صفحہ ۶۲ پر یہ درج ہے کہ جب خواجہ محمد باسط میر کو نواب امیرالامرا کی خدمت میں لے گئے اور نواب نے پوچھا کہ "ایں پسر از کیست؟ خواجہ نے جواب دیا کہ "از میر محمد علی است"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کا اصلی نام محمد علی تھا۔ اسی طرح سے صفحہ ۵ پر میر نے اپنے والد کے متعلق تحریر کیا ہے کہ "جوان صالح عاشق پیشہ بود۔ دل گرمی داشت بخطاب علی متقی امتیاز یافت"۔ اس سے واضح ہے کہ علی متقی اُن کا لقب یا عرف تھا ذکر میر میں اُن کو اکثر لفظ "درویش" سے یاد کیا ہے۔ سید امان اللہ مرید خاص کے انتقال کے بعد سے اُن کے والد اپنے کو عزیز مردہ کہلوانے لگے۔ ذکر میر میں کسی مقام پر ان کے والد کو میر عبداللہ نہیں کہا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے زمانہ میں میر کے والد کے نام کے متعلق لوگوں کو غلط فہمی تھی۔ عرصہ کے بعد ایسی غلطی کا ہونا تعجب خیز نہیں ہے۔

میر حسن[۳] دہلوی نے میر کو برادر زادۂ سراج الدین خان آرزو لکھا ہے اور میر علی لطف[۴] نے صرف لکھا ہے کہ وہ خان آرزو کے دور کے رشتہ داروں میں تھے۔ آزاد نے ان کو میر کے چھوٹے سوتیلے

۱۔ آب حیات ص ۲۰۳   ۲۔ مقدمہ ذکر میر ص ۵   ۳۔ تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۲۵   ۴۔ گلشن ہند ص ۱۵۲۔

بھائی کا خالو ہونا بیان کیا ہے۔ مولوی عبدالحی[۵۱] نے بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ ذکر میر سے اب صاف طور پر ظاہر ہے کہ خان آرزو میر کے بڑے بھائی کے خالو تھے جو یقیناً سوتیلے بھائی تھے یعنی خان آرزو کی ہمشیرہ میر کی سوتیلی ماں تھیں۔ میر کی بہن میر محمد حسین کلیم دہلوی سے منسوب تھیں۔ اس رشتہ کا میر نے نکات الشعرا[۵۲] میں قرابت قریبہ سے اظہار کیا ہے:

میر کے بڑے بھائی کا نام محمد حسن تھا اور وہ حافظ تھے۔ اُن کے لڑکے محمد محسن[۵۳] تھے۔ چھوٹے بھائی کا نام محمد رضی تھا۔ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ میر کی پیدائش اُن کی بہن کی شادی کے بعد ہوئی اور چونکہ داماد کا نام محمد حسین تھا اس لیے میر کے والد نے کسی لڑکے کا نام محمد حسین نہ رکھا۔ میر[۵۴] کے بڑے بیٹے میر عسکری عرف میر کلو عرش اور چھوٹے بیٹے میر فیض علی فیض تھے۔ ایک بیٹی بھی تھیں جن کا تخلص بیگم تھا

شجرہ خاندان حسب ذیل ہے

ذکر میر[۵۵] سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کے بزرگ مع اپنے قبیلے کے حجاز سے آکر سب سے پہلے دکن میں وارد ہوئے۔ وہاں سے احمد آباد گجرات میں مقیم ہوئے۔ ان کے پردادا احمد آباد گجرات سے اکبر آباد آئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ میر کے دادا اکبر آباد میں فوج دار مقرر ہوئے اور

---

[۵۱] گل رعنا ص۱۵۱ [۵۲] نکات الشعرا ص۹۵ [۵۳] نکات الشعرا ص۱۳۸ [۵۴] مقدمہ نفیض میر ص۱۰ [۵۵] ذکر میر ص۳

پچاس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ بڑے کو خلل دماغ تھا اس کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا۔ اور ان کے چھوٹے لڑکے میر کے والد تھے۔

سیادت ان کے نسب کے متعلق آزاد نے لکھا ہے کہ یہ شرفائے اکبر آباد سے تھے۔ اپنے کو سید کہتے تھے لیکن ان کے زمانے میں کچھ لوگ اس دعوے پر حرف زن تھے۔ تذکرۂ شورش میں ہے کہ خطاب سیادت ان کو شاعری کی درگاہ سے عطا ہوا۔ اور آب حیات میں آزاد نے یہ لکھا ہے کہ چند کہن سال بزرگوں سے انھوں نے سنا تھا کہ میر کے والد نے اُن کو متنبہ کیا تھا کہ میر تخلص کرنے سے سید بنجائینگے سودا کا ایک شعر آزاد نے نقل کیا ہے جو کلیات میں نہیں پایا جاتا اور وہ میر کے شرافت کی ہجو میں ہے:

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کرکے میر
کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر

سودا کا ایک دوسرا شعر جو مشہور ہے اور جس میں میر ہی کے خاندان کی طرف اشارہ ہے یہ ہے:

میری کے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد[۱۵]
بیٹا تو گندنا ہے اور آپ کو تہ میر

بلا کسی شہرت یا بنیاد کے ذات پر حملہ کرنا ایک تعجب خیز بات تھی۔ زمانۂ حال کے تمام نکتہ چین آزاد کے اس شبہ کرنے پر مضحکہ کرتے ہیں۔ اور دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ میر ہمیشہ اپنے کو سید کہتے تھے اور ذکر میر میں بھی اپنے کو میر لکھا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا لقب میر مشہور تھا۔ لکھنؤ میں انکو سب سید یقین کرتے تھے اور خود میر نے اپنے کو برابر سید لکھا۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

لیکن مطبوعہ ذکر میر میں بھی میر نے اپنے کو سوائے میر تقی علی لکھنے کے صاف طور پر سید ہونیکا

---

[۱۵] مصالح یعنی مسالے۔ گندنا ایک قسم کا سبزہ خوردنی جو لہسن سے مشابہ ہے۔ کوتہ میر ہرا دھنیا۔ کشنیز سبز

دعویٰ نہیں کیا ہے۔ اپنے دادا یا پردادا کا نام ظاہر نہیں کیا ہے۔ اپنے والد کو بھی سید نہیں لکھا ہے۔ اور نہ اپنے بھائیوں میں سے کسی کو میر یا سید کے لقب سے یاد کیا ہے۔ بخلاف اس کے غیروں کو مثلاً امان اللہ، مکمل خاں اور سعادت علی خاں کو سید لکھا ہے۔ البتہ مولوی مسعود حسن رضوی کے نسخہ میں "حقیقتِ حالِ مصنف"[52] زیرِ عنوان اپنے متعلق یہ لکھا ہے کہ "کسے فقیر و سید و شاعر و متوکل دانستہ بطریق نذر چیزے می فرستد"[53] مولوی عبدالحق[54] نے اپنے مقدمہ میں یہ لکھا ہے کہ میر صاحب نے ذکر میر میں ہر مقام پر اپنے والد کے نام کے ساتھ میر کا لفظ لکھا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ میر صاحب اپنے والد کو ہر جگہ میر علی متقی لکھتے ہیں۔ اسی سے مولوی محمد عسکری[55] نے بھی نقل کیا ہے لیکن ایسا لکھنا نہایت تعجب خیز ہے کیونکہ ذکر میر میں برابر اپنے والد کو علی متقی یا درویش یا عزیز مردہ کہہ کر حوالہ دیا گیا ہے۔ کسی جگہ پر میر علی متقی مجھے نہیں ملا۔ صرف[56] ایک جگہ میر محمد علی و رح ہے "حقیقت میں جب علی متقی ان کا صرف لقب تھا تو اس کے پہلے میر لکھنا ہرگز موزوں نہ ہوتا۔ نہ کوئی درویش صفت بزرگ خود اپنے کو ایسا کہلانا پسند کرتا البتہ مضامین کے عنوان جو چھپے ہیں ان میں میر متقی علی لکھا ہے۔ مگر مولوی عبدالحق[55] نے اپنے مقدمہ میں خود تسلیم کیا ہے کہ یہ عنوان اصل میں موجود نہیں ہیں اور وہ خود ان کے اضافہ کیے ہوئے ہیں۔ مولوی مسعود رضوی کے نسخہ میں بھی اس قسم کے عنوان موجود نہیں ہیں اور نہ مولوی محمد شفیع کے نسخہ میں ہیں۔

دوسرا دعویٰ دونوں صاحبوں[56] نے یہ کیا ہے کہ اس کتاب میں میر نے اپنے والد کی زبانی اپنا نام میر محمد تقی لکھا ہے۔ اوّل تو ان کے والد کی زبانی اس طرح پر خطاب کیا جانا مجھے نہیں ملا۔ دوم یہ کہ اگر ہو بھی تو یہ تعجب خیز بات ہو گی کہ ایک صوفی منش درویش اپنے دس سال کے بیٹے کو میر محمد تقی کہہ کر پکارے۔ یہ صحیح ہے کہ میر نے اپنے کو اور دوسروں کی زبانی بھی میر محمد تقی لکھا ہے۔ مگر واضح رہے کہ یہ کتاب انھوں نے ساٹھ سال کی عمر میں لکھی تھی جب وہ خود میر مشہور تھے۔ نہ تو وہ اقوال جو انھوں نے اپنے والد یا سید امان اللہ کے نقل کیے ہیں لفظ بہ لفظ اصلی ہو سکتے ہیں نہ اس کی امید کی جا سکتی ہے کہ دس سال کی عمر میں جو کچھ انھوں نے کانوں سے سنا اسے بجنسہ بعد کو قلمبند کیا۔ جب تخلص میر تھا

---

[51] مقدمہ ذکر میر صفحہ ۸ [52] مقدمہ ذکر میر صفحہ ۲ [53] تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۶۹ [54] ذکر میر صفحہ ۷۶ [55] مقدمہ ذکر میر صفحہ ف [56] مقدمہ ذکر میر صفحہ ۲ تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۶۹

تو میر صاحب مشہور ہو جانا مشکل نہ تھا۔ اور اگر حقیقت میں وہ سید نہ تھے اور سید بن بیٹھے تو ذکر میر میں اپنے کو میر لکھنا بھی کوئی غیر قابل قیاس بات نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر ذکر میر میں جیسا لکھا ہے صحیح ہے کہ میر دس سال کے تھے جب ان کے والد نے انتقال کیا تو یہ قصہ کہ اُن کے والد نے ان کو متنبہ کیا تھا کہ میر تخلص کرنے سے سید بن جائیں گے ناقابل یقین ہوگا۔ تحقیق صرف یہاں تک ہے کہ میر اپنے کو سید ضرور کہتے تھے اور سید مشہور رہے۔ اسی کے ساتھ ان کی زندگی ہی میں کچھ لوگوں نے ہجو میں ان کی سیادت پر شبہ کیا۔ اب اتنے زمانے کے بعد فیصلہ کرنا کہ درحقیقت میر سید تھے یا جیسا اکثر لوگوں نے اس زمانے میں کہا، سید بن بیٹھے تھے مشکل ہے۔

سال پیدائش میر کی عمر اور ان کی پیدائش کے سنہ میں بہت کچھ اختلاف رائے رہا ہے جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا سنہ وفات یقینی ہے لیکن ولادت کے زمانے کی تحقیق اس درجہ تک نہ تھی۔ ذکر میر کے شایع ہو جانے سے اس بحث پر ایک نئی روشنی پڑی ہے۔ جو نسخہ خان بہادر مولوی شیرانی صاحب سے مولوی عبدالحق کو ملا۔ اس میں تاریخی حالات درج کرنے کے بعد زمانے کی حالت پر میر نے تاسف ظاہر کیا ہے اور پھر اپنی ضعیفی، بیماری اور معذوری ظاہر کرتے ہوئے اپنی عمر کو ساٹھ سال بتلایا ہے۔ اس کے بعد کچھ لطائف نقل کیے ہیں اور آخر میں یہ قطعہ[1] تاریخ ہے۔

مسمی باسمی شد ای باہنر　　که این نسخه گردد به عالم سمر
ز تاریخ آگه شوی بے گماں　　فزائے عدد بست و ہفت ار برآں

چنانچہ جیسا مولوی عبدالحق نے حساب لگایا ہے ذکر میر کے ۱۱۷۰ عدد ہوتے ہیں اور اس میں ۲۷ اضافہ کرنے سے ۱۱۹۷ھ ہوتے ہیں جو کتاب کا تاریخی سال ہوگا۔ اس میں سے اگر ۶۰ منہا کر دیئے جائیں تو سال پیدائش ۱۱۳۷ھ ہوتا ہے۔ اسی کو مولوی عسکری[2] اور مرزا جعفر علی خاں اثر[3] نے بجنسہ نقل کر لیا ہے جو بڑی وقت اس نسخہ سے پیدا ہوتی تھی اس پر اب تک لحاظ نہیں کیا گیا۔ جو تاریخی واقعات درج ہیں ان میں سے اکثر ۱۱۹۷ھ کے بہت بعد کے ہیں بلکہ ۱۱۹۷ھ ۱۷۸۲ء کے مطابق ہوتا ہے۔ گورنر جنرل وارن ہسٹنگس کا لکھنؤ آنا ۱۷۸۴ء میں ہوا۔ غلام قادر خاں روہیلہ نے شاہ عالم بادشاہ کی آنکھیں ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء میں

---

[1] مقدمہ ذکر میر ص ث　[2] تاریخ ادب اردو ص ۱۷۶　[3] نیرنگ میر نمبر ص ۲۲

نکالی تھیں اور پھر غلام قادر خاں کا مرہٹوں کے ہاتھ میں گرفتار ہونا اور راستہ میں اُن کا قتل کیا جانا ۳ مارچ ۱۷۸۹ء کا واقعہ ہے جو سنہ ۱۲۰۳ھ کے مطابق ہوتا ہے اس لیے یہ یقینی بات ہے کہ قطعہ تاریخ جو لطیفوں کے بعد اس نسخہ میں درج ہے وہ اس نسخہ کے متعلق نہیں ہے بلکہ اس نسخہ کا ہے جس میں یہ بعد کے تاریخی واقعات درج نہ تھے۔ اس پیچیدگی کے حل کرنے کے لیے ایک اور قلمی نسخہ نے میری مدد کی۔ مولوی مسعود حسن صاحب رضوی لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی نے مہربانی فرماکر اپنا نسخہ ذکر میر ایک روز کے لیے مجھے عنایت فرمایا جن کا میں نہایت ممنون ہوں یہ نسخہ اس نسخہ کے مشابہ ہے جو پروفیسر محمد شفیع وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے مولوی عبدالحق کو مقابلے کے لیے دیا تھا۔ مولوی مسعود حسن رضوی اور پروفیسر محمد شفیع کے نسخے میں تاریخی واقعات اس مصرع پر ختم ہوتے ہیں۔

"ایں شامت اعمال قیامت بسر آورد"

یہ مصرع مطبوعہ نسخہ کے صفحہ ۱۲۰ پر ہے[1]۔ اس کے بعد حقیقت حال مصنف کے سلسلہ میں چند مزید سطور کے بعد قریب قریب وہی عبارت درج ہے جو عبرت و خاتمہ کے عنوان سے مطبوعہ نسخہ میں[2] موجود ہے۔ بڑا فرق یہ ہے کہ بجائے ساٹھ سال کے عمر پچاس سال درج ہے عبارت یوں ہے "پیری رسید یعنی عمر بہ پنجاہ کشید" بعد کو لطائف ہیں اور پھر اخیر میں قطعہ تاریخ ہے جس کا آخر مصرع یہ ہے۔

فزائے دہ و شش عدد گر بداں

آخر میں نسخہ ذکر میر کے اختتام پر شکر اللہ تعالیٰ ہے۔

اگر ذکر میر کے ۱۱۷۰ عدد میں ۱۶ کا اضافہ کیا جائے تو ۱۱۸۶ھ ہوتا ہے اور اس میں سے ۵۰ منہا کرنے سے ۱۱۳۶ھ سال پیدائش نکلتا ہے جو زیادہ قابل اعتبار ہے۔ ان دونوں نسخوں پر تاریخی حیثیت سے وہ اعتراض نہیں عائد ہوتا جو مطبوعہ نسخہ پر ہے کیونکہ جو آخری واقعہ حسام الدین خاں کے تنزل کا تحریر ہے وہ ۵ رجون ۱۷۷۲ء مطابق ۱۴ ربیع الاول ۱۱۸۶ھ کا ہے۔ قطعہ تاریخ چند ماہ پہلے کا ہے جب اُن کی عمر پچاس سال کی تھی اس کے بعد جو تاریخی واقعات مولوی بشیر الدین کے نسخہ میں زائد ہیں اُن میں سب سے پہلے نجف خاں کا جاٹوں پر حملہ کرنا درج ہے جو ۴ شعبان ۱۱۸۶ھ مطابق ۳۱ اکتوبر ۱۷۷۲ء کا ہے۔

۱؎ ذکر میر ص ۱۲۵ ۲؎ ذکر میر ص ۱۵۱ و ص ۱۵۳

اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ میر نے پہلا نسخہ ذکر میر کا اوائل ۱۱۸۵ھ میں ختم کیا اور قطعہ تاریخ کچھ پہلے لکھا۔ اس کے بعد کچھ واقعات اور اضافہ کیے۔ جو اس وقت تک کے تھے جب وہ دلی میں رہے۔ دلی سے لکھنؤ کی روانگی پر یعنی ۱۱۹۷ھ میں تاریخی قطعہ کا آخری مصرع بدل دیا اور اپنی عمر ساٹھ سال درج کر دی۔ یہی عبارت اور یہی قطعہ مطبوعہ نسخہ میں ہے۔ لیکن اس تبدیلی کے بعد بھی تاریخی واقعات کا اضافہ کرتے رہے اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا یعنی ۱۲۰۴ھ تک۔ مگر ان کو اپنی عمر اور تاریخی قطعہ کے ترمیم کی نوبت نہیں آئی۔

تعلیم و مذہب ذکر میر میں حمد و نعت کے بعد سبب تالیف بیان کر کے اپنے بزرگوں کے ہندوستان آنے کا تذکرہ کیا ہے۔ اور پھر اپنے والد کا ذکر کیا ہے۔ جو واقعات میر نے اپنے والد ماجد کے تحریر کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ علی متقی درویش اور صوفی مشرب تھے۔ انھوں نے علم معنوی میں شاہ کلیم اللہ سے جو اکبر آباد کے کامل اور تہجد گزار بزرگ تھے۔ اور اولیا میں سے شمار کیے جاتے تھے تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک نوجوان سید امان اللہ ان کے معتقد ہو گئے اور ان کے ساتھ رہنے لگے جن کو میر عم بزرگوار کہتے تھے۔ درویش متقی علی کی نصیحتوں اور سید امان اللہ کی تربیت کا اثر میر پر ابتدا میں پڑا اور تصوف کی تلقین کا اثر ہمیشہ باقی رہا۔

هم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں　　　اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

دیگر

لایا ہے میر شوق مجھے پردہ سے باہر　　　میں ورنہ وہی خلوتیِ راز نہاں ہوں

اس زمانہ میں اکثر صوفیوں سے صحبت رہی۔ لیکن ان دونوں کا انتقال جب میر کی دس ہی سال کی عمر تھی ہو گیا۔ ممکن ہے کہ میر نے اس زمانہ میں اپنی عمر کے تخمینہ کرنے میں غلطی کی ہو۔ جو واقعات لکھے ہیں وہ دس سال کے بچے کے لیے موزوں نہیں معلوم ہوتے۔ باوجود اس صغر سنی کے میر کو وہ نصائح اور پند یاد تھے جن کو انھوں نے اپنے تذکرہ میں مفصل نقل کیا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد کا ایک اور تعجب خیز واقعہ درج کیا ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کی عمر صرف دس سال کی تھی۔ ان کے بڑے بھائی علحدہ ہو گئے اور قرضخواہوں نے میر کا دامن پکڑا۔ بالآخر سید امان اللہ کے ایک مرید نے مدد کی اور قرض ادا ہو جانے کے بعد نعش دفن ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد میر دہلی چلے گئے اور [illegible]

آرزو کے ساتھ رہنے لگے اپنے والد کے انتقال کے بعد عنفوانِ شباب میں جب میرؔ اکبر آباد سے دلی چلے گئے تو پہلے اپنے سوتیلے ماموں کے ساتھ رہنے لگے۔ یہ زمانہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کا تھا۔ دلی ہی میں پرورش اور تعلیم پائی۔ فارسی ادب میں کمال حاصل کیا۔ لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ عربی کی استعداد کس قدر تھی؟ خان آرزو کے شاگرد تھے۔ اپنے عہدِ شباب کی تالیف نکات الشعراء[1] میں اپنے متعلق میر نے لکھا ہے کہ

"فقیر حقیر میر محمد تقی میرؔ متوطن اکبر آباد است، بہ سبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہان آباد (دہلی) است"

نکات الشعراء میں میرؔ نے خان آرزو کو اپنا استاد و پیر مرشد تسلیم کیا ہے میر حسن[2] نے بھی میرؔ کو آرزو کا شاگرد لکھا ہے۔ لیکن ذکرِ میر میں خان آرزو سے کسی قسم کی تحصیل علم کا اعتراف نہیں کیا ہے اور اپنے سوتیلے بھائی کے اشارہ پر اُن کی بے رُخی و بدسلوکی کا اظہار کیا ہے۔ ذکرِ میر سے صحیح وجہ اس بے اعتنائی کی نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ بہارِ بے خزاں سے مولوی عبد السلام[3] نے ایک روایت نقل کی ہے کہ اپنے شہر میں، عزیزوں میں سے ایک سے میرؔ کو عشق پیدا ہو گیا اور رُسوائی کے خوف سے اکبر آباد چھوڑ دیا عمر بھر اس کی حسرت باقی رہی۔

میرؔ نے، ذکرِ میر میں امیر جعفر دہلوی سے اپنی تعلیم حاصل کرنا تسلیم کیا ہے۔ اور ریختہ میں سید سعادت علی سے جو امروہہ کے رہنے والے تھے! اس کے بعد ہی اپنے خالو کی تلخ کلامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کھانا چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور مکان چھوڑ کر باہر چلے گئے اور بالآخر رعایت خاں کے ساتھ رہنے لگے۔

آزاؔد[4] کی رائے میں چونکہ خان آرزو حنفی مذہب تھے اور میرؔ شیعہ اور نازک مزاج اسی وجہ سے کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے۔ مولوی عبد الحی[5] نے اس واقعہ کو باور کرنا مشکل خیال کیا ہے۔ اور مولوی عبد الحق[6] نے بھی یقین نہیں کیا ہے۔ کوئی خاص وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ اس خیال کو بالضرور غلط قرار دیا جائے۔ ابتدا میں میرؔ کی تربیت و پرورش صوفیوں میں ہوئی۔ اس سے قیاس

---

[1] نکات الشعراء ص ۱۶۳ [2] تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۴۵ [3] شعر الہند ص ۵۵ [4] آبِ حیات ص ۲۰۵ [5] گلِ رعنا ص ۱۵۱
[6] مقدمہ ذکرِ میر ص ۳

کیا جا سکتا ہے کہ ان کے خاندان کے لوگ حنفی مذہب تھے۔ اسی کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کم سے کم زمانہ عروج شاعری میں ان کا مذہب اہل تشیعہ کا تھا۔ منقبت کے قصیدوں کے چند مصرعے اس کو ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً

مسکن علی نگر ہے مرا میں علی پرست پیغمبر اس جگہ کا علی ہے خدا علی

"یعنی کہ ذات پاک ہے اس کی خدا کی ذات"

ایک شب نبی جو نکلے زبان مکان سے ذات مبارک آئی نظر اور شان سے

تھا بزم لامکاں میں بھی رونق فزا علی

ایک مولیٰ کہے ہیں ایک خدا کہتے ہیں یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

"قالب خاکی کے پردے میں خدا تو ہی تھا"

تیرے پردے میں حق ہوا موجود جانتے ہیں تجھی کو سب معبود

مگر چونکہ میر ایک فطری شاعر تھے فن شاعری میں محو تھے۔ اسی کی دُھن تھی روشن خیال تھے۔ ان کے ابتدائی زمانہ کے کلام سے تصوف کی تعلیم و تلقین ٹپکتی ہے۔ فیض میر کی حکایتوں سے فقیروں اور درویشوں سے عقیدت معلوم ہوتی ہے۔ ان میں کسی قسم کا مذہبی تعصب نہ تھا۔ اور نہ انھوں نے کسی مقام پر شکر رنجی کی یہ وجہ بیان کی ہے۔ گو نازک مزاج تھے۔ اس لیے اختلاف مذہب کو نفاق کی اصلی وجہ یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ میر نے فارسی زبان میں بہت بڑی استعداد حاصل کی۔ چونکہ اُس زمانے میں فارسی، عدالت کی زبان تھی، اس لیے یہ کچھ غیر معمولی بات نہ تھی۔ دلی کی بود و باش کی وجہ سے، ان کا زباں داں ہونے کا دعویٰ صحیح تھا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض

اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے

دلی کی سکونت دلّی میں عرصہ دراز تک قیام رہا، یہیں ان کی شاعری نے عروج پایا اور جوانی ہی میں ان کو مسلم الثبوت اُستاد کے درجے تک پہنچا دیا۔

کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی
گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں

جہاں سے دیکھیے اک شعر شور انگیز نکلے ہے قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

ابتدا میں خواجہ محمد ناصر عندلیب کے مشاعرے میں شریک ہوتے تھے، میر نے خواجہ ناصر کو مقتدائے عالم کے نام سے یاد کیا ہے، لیکن نکات الشعرا میں ان کے کلام کو کوئی جگہ نہیں دی۔ ان کے خلفؑ خواجہ میر درد کو بزرگ و بزرگ زادہ، شاعر زور اور ریختہ لکھا ہے اور ان کی خدمت میں بندگی خاص کا اظہار کیا ہے، خواجہ صاحب کے یہاں ماہواری مشاعرے کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا، جب بند ہو گیا تو خود خواجہ درد کی تحریک سے میر نے اپنے یہاں مشاعرہ قائم کیا اور خود ہی اس کے میر مجلس ہوئے۔ یہ مشاعرہ ہر مہینہ کی پندرھویں کو ہوتا رہا اور خواجہ صاحب بھی شرکت کرتے رہے۔

لکھنؤ میں آمد بارھویں صدی ہجری کا آخر حصہ سلطنت مغلیہ پر مرہٹوں کی چڑھائی کا زمانہ تھا، یہی زمانہ شاہی دربار (دربار شاہ عالم) کے تنزّل کا تھا۔ عام پریشانی کی وجہ سے شعر و سخن پر بہت بڑا اثر پڑا، اکثر سخنور شعرا نے دہلی سے کوچ کرنے کی زحمت گوارا کی۔ آرزو، سودا، اور میر سوز وغیرہ لکھنؤ چلے آئے لیکن میر عرصہ تک خواجہ میر درد کی تقلید میں دہلی ہی میں مقیم رہے۔ مولوی عبدالحی نے میر سے پہلے میر سوز کا لکھنؤ آنا درج کیا ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق نے میر سوز کا بعد میں آنا لکھا ہے۔ زیادہ قابل قیاس یہ ہے کہ میر سوز پہلے آئے ہوں گے اور یہی وجہ ہے کہ وہ نواب آصف الدولہ کے استاد ہو گئے۔ اگر میر پہلے آئے ہوتے تو یقیناً میر ایسے مسلم الثبوت شاعر کو نواب اپنا استاد مانتے۔

بقول میر لطف علی لطف ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۲ء (زمانہ نواب آصف الدولہ) میں میر دہلی سے لکھنؤ چلے آئے اس وقت ان کی عمر ۶۰ سال کی ہی ہوگی۔

آزاد نے آب حیات میں میر کے لکھنؤ آنے کا سال ۱۱۹۰ھ لکھا ہے۔ جو شاید کتابت کی

---

۱ نکات الشعرا صفحہ ۵ ۲ گل رعنا صفحہ ۱۵۲ ۳ مقدمہ انتخاب کلام میر صفحہ ۲ ۴ گل رعنا صفحہ ۱۵۲

غلطی ہی۔ بہرحال یہ مسلّم ہی کہ سودا کی وفات کے بعد میر لکھنؤ آئے۔ سودا کی وفات ۱۱۹۵ھ میں ہوئی اس سے، اس وجہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کی وفات کی تاریخیں موجود ہیں۔ فخر الدین "شاعرانِ ہند کا سرور گیا" مصحفی "سودا کجا و آں سخن دلفریب او" منت "بگفت گو ہر معنی یتیم شدہ ہے"

مولوی عبدالحیٰ[1] نے میر کی لکھنؤ میں آمد، ساٹھ سال کی عمر میں خیال کی ہی۔ مولوی عبدالحق[2] نے بھی یہی تخمینہ کیا ہی۔ بعد میں، میر حسن اور جراأت بھی لکھنؤ آئے۔ دلّی میں غربت کا سامنا تھا، ظاہرا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا، سلطنت مغلیہ سے کچھ وظیفہ بھی نہ ملتا تھا، بلکہ دربار کی حاضری سے میر گریز کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا کوئی قصیدہ یا قطعہ سلطنت مغلیہ کے کسی بادشاہ کی شان میں موجود نہیں۔

میں خاک میں ملا نہ کروں کس طرح سفر　　مجھ سے غبار رکھتے ہیں اہلِ وطن تمام

اسی اثنا میں مرزا رفیع سودا نے جنھیں لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے دربار میں رسائی ہو چکی تھی اور چھ ہزار روپیہ کی جاگیر بھی مل چکی تھی، وفات پائی۔

یہ پہلے لکھا جا چکا ہی کہ اُن کی آمد ۱۱۹۷ھ میں ہوئی اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہی کہ ۱۱۹۷ ہجری میں جب میر نے قطعہ تاریخ بدلا اور اپنے حالات میں اپنی عمر ساٹھ سال لکھی تو ایک عبارت جو پہلے نسخہ میں تھی قلمزد کر دی وہ یہ ہی: "از فاقہا بجاں رسیدم بر در لے از کسے نہ کشیدم" ظاہرا اس کا سبب نواب آصف الدولہ کے دربار میں رسوخ تھا۔ سودا کی وفات ہی نے میر کو ضعیفی میں مسکن چھوڑ کر نئے شہر میں سکونت اختیار کرنے پر آمادہ کیا، دربارِ لکھنؤ کی قدردانی سخن، بمقابلہ دربارِ دہلی، زیادہ مشہور ہو چلی تھی۔ میر کا یہ خیال، کہ لکھنؤ میں اُن کی خوبیِ کلام کا زیادہ اعتراف ہو گا اور دربار میں آؤ بھگت ہو گی، بیجا نہ تھا، ان کی شہرت لکھنؤ میں اُن کے آنے سے پہلے ہی پہونچ چکی تھی جب لوگوں کو اُن کی آمد کی اطلاع ہوئی سب نے تعظیم اور استقبال کیا۔ آزاد[3] نے تحریر کیا ہی کہ لکھنؤ پہونچتے ہی سرائے میں ٹھیرے، ایک مشاعرے کی خبر سُنی، اس میں شریک ہوئے، نوجوانان لکھنؤ ان کا لباس اور طرز ادا دیکھ کر مسکرائے

---

[1] گل رعنا ص ۱۵۲　[2] مقدمہ ذکر میر ص　[3] آب حیات ص ۲۱۱

اس پر میر نے فی البدیہہ، مشاعرے کی غزل کی طرح میں ذیل کا قطعہ پڑھا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو! ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

مولوی عبدالحق[1] نے اس قصہ کو حقیقت سے بعید تصوّر کیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ ذکر میر میں لکھنؤ آنے کی وجہ نواب آصف الدولہ کی دعوت درج ہے اور نواب سالار جنگ کے یہاں جانا لکھا ہے۔ یہ بات اس قصے کی کسی طور پر تردید نہیں کرتی جب ذکر میر میں اُن کی زندگی کے بہت کم واقعات لکھے ہیں اور کسی مشاعرہ کا تو کہیں تذکرہ بھی نہیں ہے۔ لیکن میر کی کلیات میں، اس طرح پر، غزل کا پتہ نہیں چلتا۔

جب نواب آصف الدولہ کو اطلاع ہوئی، انھوں نے بقول آزاد[2] میر کا دو سَو روپیہ ماہانہ اور بقول میر لطف[3] تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر دیا۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں دو سَو روپیہ مشاہرہ رہا ہو اور بعد میں اضافہ ہو گیا ہو

میر نے نواب آصف الدولہ کی تعریف میں ایک قصیدہ پیش کیا، جس کا زبردست مطلع یہ ہے۔

ہوا کیے ہیں زبس شکوۂ فلک تحریر سیہ ہے کاغذ مشقی کے رنگ لوح ضمیر

دونوں شکار نامے نواب آصف الدولہ کے بہرائچ اور کوہ شمالی کے دامن میں شکار کھیلنے کیلئے جانے کے متعلق میر نے موزوں کیے تھے۔

اُستادی میر کی اُستادی دلّی ہی میں مسلم ہو چکی تھی۔ خود خواجہ میر درد نے ان کو اپنے یہاں مشاعرہ کرنے اور میر مجلس بننے کی تحریک کی تھی۔ گو عمر میں سودا ان سے بڑے تھے اور میر کی صغر سنی ہی میں شاعر ہو چکے تھے لیکن وہ غزل گوئی میں میر کو بھی اُستاد مانتے تھے۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ ہونا ہے تجھ کو میر سے اُستاد کی طرف

[1] مقدمہ ذکر میر ص ح [2] آب حیات ص ۲۱۱ [3] گلشن ہند ص ۱۵۳

یہ بہت بڑا فخر میر کو خود ان کی حیات ہی میں حاصل ہوا کہ سب ان کو استاد ماننے لگے مسافر ان کی غزلوں کو شہر بہ شہر تحفہ کے طور پر لے جاتے تھے۔ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت کہ میر اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تسلیم کیئے جاتے تھے یہ ہے کہ ان کی حیات ہی میں مرزا لطف علی لطف نے جو اُن کے شاگرد نہ تھے اپنی کتاب گلشن ہند مصنفہ ۱۲۱۵ھ میں، میر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"میر شیریں مقال میں اور ریختہ گویان سابق وحال میں، نسبت خورشید وماہ ہے اور فرق سفید وسیاہ ہے۔ بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا، تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا۔"

اسی طرح پر میر کے کلام کا مقبول عام اور رائج ہونا اس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۱۵ء میں، مسٹر جان شیکسپیر نے اُردو لغت طبع کرائی جس میں ہمعصر شعرا کی نسبت میر کا کلام کثرت سے بطور سند درج کیا گیا ہے۔

میر کی وفات کے بعد سے اب تک کسی شاعر نے میر کے غزل گوئی میں اُستاد ہونے سے انکار نہیں کیا۔ اپنے کلام کے متعلق میر کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز　　تاحشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

میر کا یہ کہنا کہ اُن کے بعد بھی اُن کے پردرد اور حسرت بھرے اشعار لوگوں کے دلوں پر اثر کرتے رہیں گے سچ ثابت ہوا۔

بعد ہمارے اس فن کا جو کہ ماہر ہووے گا
درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے　　رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سُنیے گا　　پڑھتے کسی کو سُنئے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

---

[1] گلشن ہند صفحہ ۱۵۲

بعد کے مشہور شعرا ناسخ، غالب، ذوق اور امیر مینائی نے میر کی استادی کی داد دی ہے۔

ناسخ کا شعر ہے۔

میں ہی کچھ ناسخ نہیں ہوں طالب دیوانِ میر
کون ہے جس کو کلام میر کی حاجت نہیں؟

دوسرا شعر ہے

[۵۱] شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی اُستادی میں آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

غالب کا شعر ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

دوسرا شعر

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذوق کا شعر ہے

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

امیر مینائی نے صنم خانۂ عشق میں لکھا ہے

سودا و میر دونوں تھے اُستاد پر امیر
ہے فرق واہ واہ میں اور آہ آہ میں

آزاد نے لکھا ہے کہ واہ واہ اور آہ آہ کا فرق خواجہ باسط لکھنوی کی ایجاد ہے۔

مولانا حالی [۵۲] نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مومن، شیفتہ، آرزو وغیرہ ایک روز بیٹھ کر میر کے اس شعر کی طرح پر قافیہ بندی کر رہے تھے

---

[۵۱] گلزارِ سخن میں پہلا مصرع یوں تحریر ہے "ناسخ اپنا تو عقیدہ ہے بقولِ آتش" یہ نقل حقیقتاً غلط ہے کلیات ناسخ میں شعر پایا جاتا ہے ورنہ آتش کے کلام میں کہیں دوسرا مصرع پایا جاتا ہے اگر دوسرا مصرع آتش کا کہا ہوا ہوتا تو غالب آتش سے نقل کرنے کا اعتراف کرتے نہ کہ ناسخ سے۔

[۵۲] مقدمہ دیوان حالی ص ۱۳۵

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

ایک دوست نے آکر آرزو سے پوچھا کہ آپ کس سوچ میں ہیں جواب ملا کہ قل ہو اللہ کا جواب لکھ رہا ہوں۔

اپنے کمال کا احساس

چونکہ تمام لوگ میر کو اُستاد مانتے تھے اور اُن کے کلام کی بیحد عزت کرتے تھے لہذا یہ تعجب خیز بات نہیں ہے کہ خود میر کو اپنی اُستادی کا احساس تھا۔ میر کے متعدد اشعار سے اس احساس کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے کلام کے متعلق جو پیشین گوئی میر نے کی تھی وہ پوری ہوئی۔ اس زمانہ میں تعلّی کا عام رواج تھا۔ کوئی نامی شاعر اپنی بڑائی کرنے سے نہ بچا۔ سودا اور مصحفی حتیٰ کہ انشا نے بھی خوب ڈینگیں ماریں اور دوسروں کی ہجویں لکھیں اس اعتبار سے میر کی تعلی گو اب ناگوار معلوم ہوتی ہے مگر اس زمانہ کے لیئے زیادہ غیر مناسب یا ناموزوں نہ تھی۔ قیاس ہے کہ لوگوں نے اس سے بھی لطف اُٹھایا ہوگا، اگرچہ عوام نے اس وقت بھی دوسروں کی ہجو اور ان کی فلت کو اخلاقاً پسند نہ کیا ہوگا۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار نقل کیئے جاتے ہیں جن سے صرف استادی ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ خدائے سخن ہونے کا دعویٰ ظاہر ہے۔

ریختہ رتبہ کو پہونچایا ہوا اس کا ہے — معتقد کون نہیں میر کی اُستادی کا
ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو — چاہیئے اہلِ سخن میر کو اُستاد کریں

مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ انتخاب کلام میر[۱] میں ایسے دس اشعار جمع کیئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر صاحب اپنے کمال سے خود واقف تھے اُن کے علاوہ جو اور اشعار میں نے کلیات سے منتخب کیئے ہیں اُن میں چار اشعار میر کی پیشین گوئی کے سلسلہ میں منجملہ چھ کے درج ہو چکے ہیں باقی اشعار ذیل میں نقل کرتا ہوں ان میں میر نے اپنی اور اپنے کلام کی بڑائی جتائی ہے۔

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا — غنیمت ہے جہاں میں دم ہمارا
زمینِ غزل ملک سی ہو گئی — یہ قطعہ تصرف میں بالکل کیا

میر کی بد دماغی کی بحث میں اشعار مندرجہ ذیل سے مدد ملے گی

[۱] مقدمہ انتخاب کلام میر ص۵

۶۔ میر کو اپنے فن پر ناز تھا

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا　　وہی آخر کو ٹھیرا فن ہمارا

تکلیف درد دل کی عبث ہم نشیں نے کی　　درد سخن نے میرے سبھوں کو رُلا دیا

ریختہ کاہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں میر　　جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے　　درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اگرچہ گوشہ نشیں ہوں میں شاعروں میں میر　　پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

ہر ورق ہر صفحہ میں اک شعرِ شور انگیز ہے　　عرصۂ محشر کا عرصہ ہے مرے دیوان کا

بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر　　سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

جس شعر میں سماع تھا کل خانقاہ میں　　وہ آج میں سُنا تو ہے میرا کہا ہوا

گو میر جہاں میں کنھوں نے تجھ کو نہ جانا　　موجود نہ تھا تو تو کہاں نام و نشاں تھا

رونقِ آبادیِ ملکِ سخن ہے اس تلک　　ہوں ہزاروں ہم الٰہی میر کے اک دم کے بیچ

پڑھ غزل میر کی جو ہو وے یاد　　اُن کو تو اس میں کہتے ہیں اُستاد

کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جبہ چاک　　ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام

کہاں عاجز سخن، قادر سخن ہوں　　ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں شعر کیوں میرے　　کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

غزل میر کی کب پڑھائی نہیں　　کہ حالت مجھے غش کی آئی نہیں

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے　　بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

سمجھے انداز شعر کا میر سے　　میر کا سا اگر کمال رکھے

اس صنائع کا اس بدائع کا　　کچھ تعجب نہیں خدائی ہے

۷۔ میر اپنے زمانے کے عام شعرا کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور ان کے کلام کو لغو سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں:-

کس کا ہے قماش ایسا گودڑ بھرے ہیں سارے
دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں

بے سوز دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا　　گفتار خام پیش عزیزاں سند نہیں

ع　سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا　　ع　ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

میر کی مثنویوں میں ایک مثنوی اژدر نامہ یا اجگر نامہ ہے۔ اس میں میر نے اپنے کو اژدر قرار دیا ہے اور دیگر شعراء کو چھوٹے جانور، جو کہ سب اژدر سے ڈرتے ہیں۔ اس کو ایک مشاعرے میں پڑھا۔ آخری شعر سے حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

کہاں پہونچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر
گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

میر کا یہ فعل کسی کو پسند نہ آیا۔ محمد امان نثار، شاگرد شاہ حاتم نے ایک قطعہ برجستہ لکھ کر پڑھا۔ سب نے میر کو خفیف کرنے کے لیئے بڑی تعریفیں کیں۔ آزاد نے اس کا ایک یہ شعر نقل کیا ہے۔

حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کر

میر کا غرور عموماً لوگوں کو ناپسند تھا اور اُن کی ہجو میں اکثر اشعار کہے گئے تھے۔ بقا[۵۲]

پگڑی اپنی سنبھالیئے گا میر
اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

مزاج و طبیعت آزاد نے آبِ حیات میں اکثر حکایتیں نقل کی ہیں جن سے میر کی نہ صرف تنک مزاجی بلکہ بد دماغی ثابت ہوتی ہے۔ ان میں سے چند نقل کرتا ہوں۔

جب دلّی سے سفر کیا تو راستہ میں اپنے ہم سفر مسافر سے بات تک نہ کی، کہ زبان خراب ہو جائیگی دوسرے کے کلام کی قدر نہ کرتے تھے۔ جب کبھی حافظ یا سعدی کا بھی کوئی شعر پڑھا جاتا تو سر نہ ہلاتے اور اس کی تعریف کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ شاگرد بنانے سے گریز کرتے تھے۔ حتیٰ کہ میر قمرالدین منت، سعادت یار خاں رنگین اور شیخ ناسخ کی غزلوں پر اصلاح دینے سے انکار کر دیا۔ اگر کچھ لوگ میر کے مکان پر، اُن کا کلام سُننے کے اشتیاق میں جاتے اور پڑھنے کی فرمائش کرتے تو کلام نہ سناتے اور جواب دیتے کہ آپ نہ سمجھیں گے۔ اپنے علاوہ ہمعصروں میں صرف سودا کو شاعر خیال کرتے تھے۔ منقول ہے کہ میر کی رائے میں خواجہ درد صرف آدھے شاعر تھے اور میر سوز جو کہ نواب آصف الدولہ کے کامل اُستاد تھے صرف چوتھائی شاعر تھے۔ دیگر شاعروں کا تو اساتذہ میں شمار ہی نہ تھا۔ نواب کی ملازمت کی حالت میں بھی دربار کی حاضری سے گریز کرتے اور

[۵۱] آبِ حیات صفحہ ۲۲۳ [۵۲] آبِ حیات صفحہ ۲۲۷

دربار میں بہت کم جاتے تھے نواب کی فرمایش سے غزل نہ کہتے تھے۔ غزل پڑھنے کی حالت میں ایک مرتبہ نواب، چھڑی سے مچھلیوں کے ساتھ کھیلنے لگے، میر ٹھیر گئے اور کہنے لگے، جب حضور متوجہ ہوں گے تو پڑھوں گا۔ نواب نے جواب دیا کہ جو شعر ہوگا وہ خود متوجہ کرلے گا، میر نے غزل پھر نہ پڑھی اور اپنے گھر چلے آئے چند روز بعد، نواب بازار سے گزرے میر کو دیکھ کر کہا "آپ تشریف نہیں لاتے"، میر نے جواب دیا بازار میں باتیں کرنا آداب شرفار کے خلاف ہے۔

نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد جب سعادت علی خاں کا زمانہ آیا تو ایک روز اُن کی سواری تحسین کی مسجد کے قریب سے ہوکر گزری، سب لوگ تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن میر نہ اُٹھے، انشار اللہ خاں نے نواب صاحب کو بتایا کہ یہ میر تھے۔ نواب نے ملازم کے ذریعہ سے خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ بھیجا، مگر میر نے صرف اس وجہ سے واپس کردیا کہ ملازم لے کر آیا تھا بعد کو انشار خود گئے اور میر کو راضی کیا، دربار میں کبھی کبھی جانے لگے۔ پھر بھی اگر کوئی بلند مرتبہ شہر بلاتا تو میر نہ جاتے اور معذرت کردیتے۔ اُن کا یہ طریقہ صرف امرار ہی کے ساتھ نہ تھا بلکہ سب کے ساتھ تھا۔ میر سوز کے ذکر پر میر نے یہ کہا کہ سوز ایسا تخلص شرفار میں ہم نے نہیں سُنا حالانکہ میر سوز نے میر کی شہرت کی وجہ سے اپنا تخلص میر چھوڑ کر سوز اختیار کیا تھا۔ نکات الشعرار کے دیباچہ میں میر نے لکھا ہے کہ ہزاروں شاعروں کا ذکر کروں گا، مگر ان ہزاروں میں سے ایک شاعر بھی بیچارہ طعنوں اور ملامتوں سے نہ بچا۔ ولی کے حق میں کہا کہ "ولی شاعریست از شیطان مشہور تر" اس پر میر خاں کمترین نے ایک نظم کہی، جس کا ایک مصرع یہ ہے ؎

"ولی پر جو سخن لائے اسے شیطان کہتے ہیں"

نکات الشعرار کے دیباچہ میں میر کے اس دعوے کو کہ اُس وقت تک ریختہ کے شعرار کا کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا تھا آزاد[۱] نے صحیح نہیں قرار دیا ہے لیکن کسی اور تذکرہ کا حوالہ بھی نہیں دیا ہے

مولوی عبدالحی[۲] نے گل رعنا میں ان حکایتوں پر شک کا اظہار کیا ہے۔ اور بازار میں نواب سے گفتگو نہ کرنے کو اس بنا پر غلط قرار دیا ہے کہ یہ تو خلل دماغی کی حد تک پہونچتا ہے۔ اوروں کے

---

[۱] آب حیات ص۲۱۶　[۲] گل رعنا ص۱۵

کمال کو نہ دیکھنے کی تردید میں نکات الشعرا کا حوالہ پیش کیا ہے، ولی کے خلاف شان الفاظ کی تکذیب، نکات الشعرا میں اُن کے نہ پائے جانے سے ہوتی ہے۔

اسی طرح سے مولنا حبیب[۱] الرحمٰن خاں شروانی نے میر کو منکسر المزاج انسان قرار دیا ہے اور ان کے خیال میں، "تذکرہ میں میر کے قلم سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلا جس سے اُن کی خود بینی، خود پسندی، بد دماغی اور تعلّی عیاں ہوتی ہو۔" یہ نتیجہ صرف اس بات پر مبنی ہے کہ میر نے اپنے آپ کو بندہ، فقیر، احقر، عاجز ترین خلائق اور ہیچمدان کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

ایسے ہی مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ ذکر میر میں اکثر قصّوں کو جن کو آزاد نے نقل کیا ہے ناقابل یقین خیال کیا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض حکایتیں جو آزاد نے نقل کی ہیں، اُن میں کچھ مبالغہ ہو اور اُن کی بنیاد سُنے ہوئے قصّے ہوں، لیکن "تاریخی واقعات اور خود میر کے اشعار سے ان کا منکسر المزاج ہونا تو درکنار بلکہ متکبر اور بد دماغ ہونا ضرور ظاہر ہوتا ہے اور آزاد کی رائے کی پوری تائید ہوتی ہے صرف آزاد ہی نے نہیں بلکہ میر حسن نے بھی میر کو لکھا ہے کہ "بسیار صاحب دماغ است و دماغ او می زیبد"

اگر اُن کا غرور جنون کی حد تک بھی پہونچا ہوا معلوم ہو تو تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ اُن کے چچا مجنون تھے اور میر کو بھی زمانہ شباب میں ایک مرتبہ جنون کا دورہ ہو چکا تھا اور اس مسئلے پر اُن کی مثنوی خواب و خیال سے بھی روشنی پڑتی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ آزاد نے اپنے تذکرہ میں میر پر جو الزام ہزار شعرا میں سے ایک کو بھی طعن اور ملامت سے نہ چھوڑنے کا لگایا ہے وہ بے بنیاد ہے۔ نکات الشعرا کا جو تذکرہ انجمن ترقی اردو نے چھاپا ہے وہ ایک مختصر رسالہ ہے اور اس میں صرف ۱۰۲ شعرا کا ذکر ہے جس طرح پر اکثر شعرا کا بیان کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ میر دوسرے شعرا کے کلام کی داد دینے سے قاصر نہ رہے اور نہ میر نے ان کی تعریفیں اُٹھا رکھیں، تذکرہ میں بہت سی جگہوں پر اکثر شعرا کو کلام خیر سے یاد کیا گیا ہے۔ مولنا حبیب[۱] الرحمٰن خاں شروانی اور مولوی عبدالحق کا یہ خیال کہ آزاد کو نکات الشعرا کا نسخہ دستیاب نہ ہوسکا تھا اور اُنھوں نے یہ الزام محض خیالی طور سے قایم کر دیا، بہ ظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تذکرہ میں جب مسلّمہ شعرا کا انتخاب کیا اور ان کے کلام سے منتخب اشعار نقل کیے تو نہ ہجو کا موقع تھا اور نہ نکتہ چینی کا اور نہ تحریر میں سب پر حملہ کرکے

---

[۱] مقدمہ نکات الشعرا ص۳ [۲] تذکرہ شعرائے اُردو ص۱۶۵ [۳] مقدمہ نکات الشعرا ص۲۳ [۴] گل رعنا ص۱۵۱

اپنے اوپر حملہ رجوع کرنا کار عقلمند ہوتا، ولی کی شان کے خلاف کوئی لفظ تذکرہ میں نہیں، اسی کے ساتھ ولی کے کلام کی تعریف سے بھی عمداً پرہیز کیا گیا ہے، صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ "از کمال شہرت احتیاج تعریف نہ دارد" اگر یہی اصول مدنظر تھا تو "سودا" اور میر درد کی تعریف بھی بیکار تھی۔ شیخ حاتم کو مرد جاہل قرار دیا ہے۔ بعض چھوٹے شاعروں کی ہجو بھی ہے۔ فی الحقیقت یہ خیال کرنے کی بھی گنجایش ہو سکتی ہے کہ جو نسخہ آزاد نے دیکھا تھا ممکن ہے کہ وہ انجمن ترقی اردو کو دستیاب نہ ہو سکا ہو۔ یا میر نے اصل نسخہ میں بعد کو وقتاً فوقتاً کچھ ترمیم کر دی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ فی الحقیقت آزاد نے نکات الشعرا کا کوئی بھی نسخہ نہیں دیکھا اور جو کچھ سنا تھا لکھ دیا۔ اس نسخہ میں اکثر مشہور مستند شعرا کا نہ تو علحدہ تذکرہ ہے اور نہ اُن کے کلام کا انتخاب مثلاً خواجہ ناصر عندلیب کا کوئی بھی شعر درج نہیں ہے۔ اشرف علی خاں فغاں۔ بقاء اللہ خاں بقا جیسے شعرا کا بھی تذکرہ چھوٹ گیا ہے مگر اکثر چھوٹے شعرا کا کلام درج ہے۔ میر سوز کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نکات الشعرا کے تصنیف کا زمانہ میر کا عہد شباب تھا اور وہی احمد شاہ بادشاہ کی سلطنت کا زمانہ تھا۔

میر کے بد دماغ ہونے کا اس سے زبردست اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خود میر کو تسلیم ہے کہ اُن کو لوگ میر بے دماغ کے لقب سے یاد کرتے تھے خود اُن کے احباب میں اُن کا بد دماغ مشہور ہونا، واقعی ان کی بد دماغی کی کافی دلیل ہے، میر ایسے استاد کا نام جن کی سب قدر و عزت کرتے تھے اور ان کے کلام کو لوگ سر اور آنکھوں پر رکھتے تھے، ہرگز بد دماغ نہ رکھا جاتا اگر ان میں فی الواقع بد دماغی نہ ہوتی، یہ میر کا تکبر ہی تھا کہ اس شہرت کو اُنھوں نے اپنی بد دماغی پر محمول نہیں کیا بلکہ عوام کی بے دماغی کا سبب خیال کیا۔

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ　　دل شورش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ　　ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

تمام نسخوں میں بے دماغ درج ہے نہ کہ بد دماغ۔ حالانکہ اگر میر بدنام تھے تو بد دماغ یعنی متکبر مشہور رہے ہوں گے نہ کہ صرف بے دماغ جس کے معنی نازک مزاج کے ہیں۔

دوسرا ثبوت اس بات کا کہ اپنے ہمعصروں میں میر سوائے مرزا سودا اور خواجہ میر درد کے

کسی اور کو شاعر نہیں مانتے تھے خود اُن کے کلام سے پایا جاتا ہے۔

کیا رہا ہے مشاعرے میں اب لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں
میر و مرزا رفیع و خواجہ میر کتنے اک یہ جوان ہوتے ہیں

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ میر شاگرد بنانے سے گریز کرتے تھے، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ میر کو بڑے درجے کے شاگرد نصیب نہ ہوئے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ لوگ میر کے شاگرد بننے کے خواہشمند نہ تھے لیکن یہ ضرور ہے کہ میر کی کج خلقی حائل تھی جو باوجود اُن کی مسلم الثبوت استادی کے نامور شعراء کو ان کی شاگردی کی طرف رجوع نہ کر سکی اور نہ اُن کو، اُن کی ناز برداری کی ہمت دلا سکی۔ ان کے شاگردوں میں، سخن، عشق، آرزو، آبرو، راسخ اور تجلّی ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ، نثار، میاں جگن، محمد محسن، مجنون. اور شکیبا بھی ہوئے۔

چوتھا ثبوت خود میر کی تصنیف "ذکر میر" سے ہوتا ہے۔ ایک[1] روز سادات خاں نے میر سے یہ خواہش ظاہر کی کہ قوال کے لڑکے کو اپنے دو تین شعر بتا دیں تاکہ وہ گائے میر نے اس کو ناپسند کیا۔ جب خاں نے سر کی قسم دی تو چند شعر یاد کرا دیئے۔ لیکن یہ اس قدر ناگوار خاطر ہوا کہ دو تین روز کے بعد سے اُن کے یہاں کا جانا ترک کر دیا اور باوجود اصرار کے پھر نہ گئے حالانکہ خاں نے میر کے چھوٹے بھائی محمد رضی کو اپنے یہاں نوکر بھی رکھ لیا۔ راجہ جگل[2] کشور بڑی خوشامد سے میر کو اپنے گھر لے گئے اور اپنے شعر اصلاح کے لیئے پیش کیئے میر نے ان کو قابل اصلاح بھی نہ سمجھا اور ان پر خط کھینچ دیا، میر نے غصّہ[3] میں آکر راجہ ناگرل کی رفاقت جو اُن پر مہربان تھے بلا کسی معقول وجہ کے ترک کر دی۔ اپنی خانہ[4] نشینی کے سلسلہ میں میر نے خود تسلیم کیا ہے کہ بادشاہ نے اکثر تکلیف دینی چاہی لیکن میر نہ گئے۔ پھر بھی بادشاہ کبھی کبھی کچھ چیزیں بھیجتے رہے۔

پانچویں واقعے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جو یہ ہے کہ اکثر شاگردوں نے میر کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد، میر کو چھوڑ دیا اور دیگر اساتذہ سے تلمذ کرنے لگے۔ ممکن نہیں تھا کہ اگر میر خلیق ہوتے تو یہ لوگ اُن کو چھوڑ دیتے۔

---

[1] ذکر میر ص۸۰ [2] ذکر میر ص۹۵ [3] ذکر میر ص۱۲۱ حاشیہ [4] ذکر میر ص۱۳۵

مولانا حبیب الرحمٰن خان نے ایک ایسے منحرف شاگرد راقم کا کلام نکات الشعرا میں درج کرنے کو اس کا ثبوت قرار دیا ہے کہ میر صاحب بد دماغ نہ تھے۔ حالانکہ راقم کے متعلق یہ لکھ کر کہ "مشق شعر از میرزا رفیع می کند، قبل ازیں از ما فقیر نیز مشورت شعری کرد"، دل میں کدورت کی وجہ سے میر نے پہلے وہ شعر نقل کیا ہے جس کو لکھا ہے کہ عبدالحیٔ تاباں کے دیوان سے ردیف بدل کر لیا گیا ہے اور آخر میں راقم کو نومشق کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

چھٹی یہ بات ہے کہ میر کو رئیسوں کی تعریف کرنا پسند نہ تھی فرماتے ہیں۔

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں

یہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ احمد شاہ، بادشاہ دہلی کی شان میں انھوں نے کوئی قصیدہ نہ کہا حالانکہ عمر کا زیادہ حصہ دلی ہی میں بسر ہوا۔ البتہ نواب آصف الدولہ کی شان میں کچھ قصائد اور مثنویات ہیں لیکن اگلے عنوان کے مطالعے سے ظاہر ہوگا کہ میر کو درباداری سے سخت گریز تھا۔ اپنا درجہ وہ اس قدر اعلیٰ سمجھتے تھے کہ ان کی کتنی ہی قدر کی جائے لیکن وہ اس کو قدردانی نہ خیال کرتے تھے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ سودا کو دربار لکھنؤ سے دیگر خلعت او انعامات کے علاوہ چھ ہزار روپیہ کی جاگیر ملی، اس کے مقابلہ میں دو سو روپیہ یا زیادہ سے زیادہ تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ کو جو بالالتزام نہ ملتا تھا میر بہت کم سمجھتے تھے اور اسی لیئے اپنی ناقدری تصور کرتے تھے۔ فقر اور گوشہ نشینی کو ایسی درباداری پر ترجیح دیتے تھے۔

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا خریدار لیکن نہ پایا گیا
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر گوئیا جنس ناروا ہیں ہم

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

لہ مقدمہ نکات الشعرا صلہ

ساتویں یہ بات ہو کہ خود میر کے اشعار سے ثابت ہو کہ اُن کے خیال میں عوام اُن کے کلام کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے ـ مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہو فلک برسوں ٭ تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

سہل ہو میر کا سمجھنا کیا ہر سخن اس کا اک مقام سے ہو
نکتہ داں بھی خدا نے تم کو کیا پر ہمارا نہ مدعا سمجھے
میر صاحب کا ہر سخن ہو رمز بے حقیقت ہو شیخ کیا سمجھے

آشفتہ حالی دلی کے قیام کے آخر زمانہ میں میر بہت تنگی سے بسر اوقات کرتے تھے۔ جو پہلا نسخہ ذکر میر کا ہو اُس میں ۱۱۷۴ھ سے گوشہ نشینی اختیار کرنا بیان کیا ہو۔ اور فاقوں تک کا ذکر کیا ہو۔ بعد کے نسخہ میں یہ آخری فقرہ قلمزد کر دیا۔

آزاد نے لکھا ہو کہ "میر دربار داری کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے اور فقر و فاقہ میں گذارہ کرتے رہے" اس میں شک نہیں کہ آزاد کی اس رائے کی کافی تائید میر کے طرز کلام سے ہوتی ہو۔ درد آمیز مضامین، مایوسانہ خیالات، رنج کی باتیں اور رونا دھونا اُن کے اشعار میں ہر جگہ پایا جاتا ہو۔ جو ہجو انھوں نے اپنے مکان کی کی ہو وہ سراپا غربت کا نمونہ ہو۔ جا بجا جو اشعار اپنے متعلق لکھے ہیں اُن سے بھی تلخ زندگی کا بسر ہونا پایا جاتا ہو۔

کسب اور کیا ہوتا عوض ریختہ کے کاش
پچھتائے بہت میر ہم اس کام کو کر کے

ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ

گل رعنا میں مولوی عبدالحیٔ نے اس واقعہ نگاری پر اعتراض کیا ہو اور اُن کی رائے میں میر کا وظیفہ آخر وقت تک بند نہ ہوا تھا۔ اس کی سند میں میر لطف علی کا مقولہ گلشن ہند سے نقل کیا ہو کہ "اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہ ہوا اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد وزارت میں آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں وہی حال ہو" اس کا معقول جواب خود گلشن ہند میں ہی موجود ہو جو تعجب ہو کہ نظرانداز ہوا۔ میرزا[۱] خود لکھتے ہیں کہ "میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہو خیال کا، اور جادو طرازی

---

[۱] گلشن ہند صـ ۱۵۲

بیان میں معانی پرداز ہی مقال کا۔ وہ نان شبینہ کا محتاج ہی، اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھا آج ہی"۔ یہ دونوں قول صرف ایک ہی مصنف کے ہیں جو ظاہراً متضاد ہیں حقیقت میں ایک حد تک دونوں صحیح ہوسکتے ہیں۔ شاہی دفتر میں وظیفہ کا اندراج قائم رہنا ایک چیز اور اس کا برابر ملنا بالکل دوسری چیز ہی۔ تنخواہ بند نہ ہو لیکن اگر بقول غالبؔ مُردہ کی چھ ماہی ہوئی تو اس سے تکلیف اور تنگی قایم رہی اس قسم کا دستور ہندوستانی سلطنتوں کے زمانہ انحطاط میں تعجب خیز نہ تھا۔ خود میرؔ کے اشعار سے اس کی کافی تائید ہوتی ہی۔

مدت مدید گزری پچھے کرتے انتظار — خجلت ہوئی جو حال لکھا میں نے بار بار

اس فرد دستخطی کو ہی یہ ماہ ہفتمیں — تنخواہ کا نہیں ہی ٹھکانا ابھی کہیں

برسوں ہوئے مہینوں کے وعدے ہوئے عید — سچ کہتے ہیں کہ کچھ نہیں ان جھوٹوں سے بعید

دربار سے متواتر غیر حاضری خود میرؔ کے کلام سے ثابت ہی۔ اول تو مزاج میں اس قدر تکبّر تھا کہ خوشامد کرنا جو اس وقت آداب درباری میں داخل تھا ان کو گوارہ نہ تھا۔ دوم یہ کہ میرؔ کو قصیدہ گوئی پر اعلےٰ پیمانہ کی قدرت نہ تھی۔ اور وہ شوکتِ الفاظ جو دربار کے لئے زیبا ہی اُن کی مایوسانہ طبیعت اور غم زدہ پست ہمتی، اُن کے لئے مہیا نہ کرنے دیتی تھی۔ سوداؔ کا زمانہ گزر چکا تھا، جس نے قصیدہ کا رنگ چمکا دیا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں سوداؔ کے کلام کا دبدبہ گھر کئے ہوئے تھا۔ صرف غزلیات سے وہ مزہ نہ مل سکتا تھا۔ نواب کے سامنے صرف ایک غزل پڑھنے سے وہ اثر نہ پیدا ہوسکتا تھا جو ایک شاندار قصیدہ سے ہوتا ہے۔ قصائد پر قادر الکلامی درباری ترقی کے لئے لازم ملزوم ہی۔ یہی وجہ ہی کہ سوداؔ کی آؤ بھگت دربار میں بمقابلہ میرؔ زیادہ ہوئی۔ میرؔ کے لئے ایک خاص دقت یہ پیدا ہوئی کہ ان کے لکھنؤ کی آمد سے پہلے سوداؔ کا زمانہ تو گزر ہی گزرا تھا۔ اور اُن کے اخیر زمانہ میں انشاؔ ایسا برجستہ گو، شوخ زبان اور حاضر جواب شاعر پیدا ہوا۔ گو فن شاعری میں میرؔ سے اس کو کوئی نسبت نہ تھی، شستہ زبان اور پھکّڑ کا مقابلہ تھا۔ پھر بھی اس کا طرز نواب کے پسند خاطر تھا۔ جس نے دربار پر اپنا سکّہ جما لیا۔ صرف درد آمیز اور غمزدہ کلام ہمیشہ کا رونا، جو میرؔ کا خاصہ تھا، درباری شان کے لئے موزوں نہ تھا۔ اس لئے تعجب کی بات نہیں ہی کہ میرؔ شکستہ دل ہوکر دربار سے گریز کرنے لگے۔ رنجیدہ خاطر اور مایوسانہ زندگی گھر بیٹھے بسر کرنے لگے

خود اُن کے اشعار اس طرزِ معاشرت کا اظہار کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تھا میں فقیر پر نہ گیا شاہ کے حضور　　اتنے لیئے کہ رتبۂ عزت مرا ہی دور

آداب سلطنت سے نہیں مجھ کو رابطہ　　حرکت نہ ہوتی مجھ سے کوئی غیر ضابطہ

صحبت خدا ہی جانے پڑے کیسی اتفاق　　کیا بات آوے بیچ میں بے ربطگی ہو شاق

ناقدردانی اور تنگی سے ضعیفی میں دلّی چھوڑ کر لکھنو آئے۔ ذکر میر کے پہلے نسخہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پچاس سال ہی کی عمر میں میر کو بیماری ضعف بصارت اور ناتوانی کی شکایت[۱] چلی تھی لکھنؤ میں عزت و قدر کیئے جانے کے باوجود اُن کے حسب خواہش اُن کی خاطرداری نہ ہوئی۔ آخر عمر تک روتے ہی گزری۔ اکثر اپنے پہلے وطن دلّی ہی کو یاد کرتے تھے۔ اور وہاں سے لکھنؤ چلے آنے پر افسوس کیا کرتے تھے۔

مزا یہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا　　وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

متاعِ ہنر پھیر لیکر چلو　　بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

بہرحال دلی واپس جانے کی کبھی ہمت نہ پڑی اور نہ وہاں فارغ البالی کی کوئی زیادہ اُمید ہوسکتی تھی اس لیئے صبر و قناعت کے ساتھ لکھنؤ ہی میں مقیم رہے۔

بے زری کا نہ کر گلہ غافل
رہ تسلی کہ یوں مقدّر تھا

لکھنؤ آنے کے زمانہ میں جب اُن کی عمر ساٹھ[۲] سال کی ہوگئی تو ناسازی مزاج بڑھ گئی لوگوں سے ملاقات کرنا ترک کر دیا۔ اکثر اوقات بیماری رہا کرتی تھی۔ آنکھوں میں درد ہونے لگا ضعف بصر کی شکایت ہوگئی۔ عینک کا استعمال شروع کیا۔ ضعف قویٰ، بے دماغی، ناتوانی، دلشکستگی اور آزردہ خاطری محسوس ہونے لگی لیکن آخر زمانہ تک شعر گوئی نہ چھوڑی حتیٰ کہ جب آواز بالکل پست ہوگئی تھی اور مشکل سے مشاعرہ میں غزل پڑھ سکتے تھے، بلند آوازی سے پڑھنا تو درکنار، تب بھی جیسا مرزا قتیل نے اپنے رقعات میں لکھا ہے، اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ مگر اس بات کا احساس بھی کرتے رہے کہ بوجہ ضعیفی اور اضمحلال قوائے جوانی کا زور باقی نہ رہا۔

---

[۱] ذکر میر ص۱۵۲　[۲] ذکر میر ص۱۵۲-۱۵۳

لطفِ سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میر — اب شعر ہم پڑھے ہیں تو وہ شستہ دہنیں

میر کس کو اب دماغِ گفتگو — عمر گزری ریختہ چھوٹا گیا

اکثر اپنی جوانی کی شان کو یاد کرکے افسوس کرتے تھے اور ضعیفی کے عالمِ بیکسی پر رنج۔

یہ میرِ ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا — اندازِ سخن کا سبب شور و فغاں تھا

جادو کی پری پرچۂ ابیات تھا اس کا — منہ تکیے غزل پڑھیے عجب سحر بیاں تھا

جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا — ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آبِ زدہ خاک — آندھی تھا بلا تھا کوئی آشوبِ جہاں تھا

وفات

میر کا انتقال بمقام لکھنؤ ۱۲۲۵ھ میں ہوا۔ وہیں دفن ہوئے لیکن افسوس ہے کہ باوجود اس شہرت کے اُن کی قبر پر نہ تو کوئی سنگ نصب کیا گیا اور نہ کہیں مزار بنا۔ اس لیے اس کا بھی پتہ نہیں ہے کہ کس جگہ دفن ہوئے۔ سنِ وفات کا تعین ناسخ کی کہی ہوئی تاریخ سے ہوتا ہے "واویلا مُرد شہِ شاعراں"[2]، جو مطابق ۱۸۱۰ء ہے۔

بقول[1] آزاد اُن کی عمر سو برس کی تھی۔ مولوی عبدالحی[2] نے بھی یہی تخمینہ عمر کا نقل کیا ہے۔ اور پہلے مولوی[3] عبدالحق نے بھی اس کو صحیح مانا تھا۔ اب ذکرِ میر کے شایع ہو جانے کے بعد اُنھوں[4] نے عمر کا تخمینہ ۹۸ سال کیا ہے۔ مصحفی[5] کے تذکرہ کی تاریخ کے حساب سے ۹۰ سال ہوتے ہیں لیکن جہاں نے ان کی عمر ۸۸ ہی برس لکھی ہے۔ میں نے جو سنہ ولادت کا نکالا ہے اُس (یعنی ۱۱۳۶ھ) کے حساب سے میر کی عمر قریب ۹۰ سال کی ہوتی ہے۔ دوسرے کی عمر کے تخمینہ کرنے میں خصوصاً جب وہ بہت ضعیف ہو اور اس کے قویٰ مضمحل ہوں بہت غلطی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ مصحفی نے میر کی عمر کو بہت زیادہ تصور کیا۔ چونکہ میر کا انتقال لکھنؤ میں ہوا اسی وجہ سے آزاد کو ان کی عمر کی صحیح واقفیت نہ ہو سکی۔

اُن کے تاریخی حالات کے ختم کرنے میں خود ان کا شعر جو حسبِ حال تھا آخر میں درج کرنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا۔

اب خدا مغفرت کرے اس کو — میرِ مرحوم تھا عجب کوئی

۱؎ آبِ حیات ص۲۱۲ ۲؎ گلِ رعنا ص۱۸۹ ۳؎ مقدمہ انتخاب کلام میر ص۸ ۴؎ مقدمہ ذکرِ میر ص ک ۵؎ مقدمہ ذکرِ میر ص ع

طرز کلام

میر کے کلام کی خصوصیت ان کی سادگی ہے۔ روزمرہ کے سہل اور آسان الفاظ میں حسن و خوبی سے اظہار خیال کرنے میں ان کو کمال حاصل ہے سلاست زبان اور صفائی ان کا خاص حصہ ہے۔ ان کے کلام کو اگر سہل ممتنع کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا مثلاً

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا لہو آتا ہے جب نہیں آتا

اشعار زیادہ تر درد آمیز ہیں۔ سوز و گداز سے بھرے ہوئے ہیں۔ نالہ و زاری اور حسرت و یاس سے پُر ہیں۔ ظرافت چھو بھی نہیں گئی ہے

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

ان کی مایوسی اور زندگی کی ناکامی کا پتہ اشعار ذیل سے چلتا ہے۔

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

مانند شمع آتش غم سے پگھل گیا بزم جہاں میں روتے ہی روتے میں گل گیا

چھوٹی بحروں میں غزلیات کہنے میں میر کے ہم پلہ کوئی دوسرا شاعر اب تک نہ ہوا۔ خاص خاص قافیوں اور بحروں میں جو اُن کی طبیعت کے مناسب تھے۔ لاجواب اشعار ان کے قلم سے نکلے ہیں مولانا حالی کا قول ہے کہ غالباً سب سے پہلے میر ہی نے زبان اُردو میں عشقیہ قصے مثنوی کے طرز میں بیان کیئے ہیں۔ زبان کی سادگی اور سلاست ہی کی وجہ سے آزاد نے میر صاحب کو سعدی ہند کہا ہے۔ حقیقت میں اگرچہ شستگی، پاکیزہ بیانی، سادگی اور تاثیر کلام کے اعتبار سے میر کا رتبہ سب سے اعلیٰ ہے لیکن فطرتاً وہ پژمردہ دل تھے۔ دردمند خیالات میں محو رہا کرتے تھے۔ خندگی یا بشاشت تو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ اسی لیئے ہمیشہ درد آمیز شعر نکلتے تھے۔ ہجر، غم اور درد کے تذکرہ سے ان کو دلبستگی تھی ناکامیِ عشق ہی کا ذکر بار بار آتا تھا۔ عیش و نشاط یا وصل کا ذکر ان کے کلام میں بہت کم ہے۔ درد انگیز اور مایوسانہ طرز فی الواقع اُن کے مزاج کی ساخت کا پتہ دیتا ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زندگی پریشانی میں بسر ہوتی تھی۔ کلام سے جو حسرت اور مایوسی ٹپکتی ہے، اس کی وجہ ان کی زندگی کے واقعات ہیں

عمر کا زیادہ حصہ یعنی ساٹھ سال دلی میں بسر ہوا۔ لیکن یہ زمانہ دلی کی تباہی کا تھا۔ برابر ہر قسم کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب حالت ناقابل برداشت ہو گئی تو لکھنؤ کی شہرت سن کر بڑی امیدوں کے ساتھ باوجود ضعیفی، ناتوانی اور بیماری کے لکھنؤ چلے آئے پہلے تو بڑی آؤ بھگت اور خاطر و مدارات ہوئی لوگوں نے بڑی عزت کی اور استاد تسلیم کیا۔ لیکن میر کی طبیعت درباداری کے لئے مناسب نہ تھی، تعریفی شہآ یا قصائد میں سودا جیسی مہارت نہ تھی اور نہ انشا جیسی برجستہ کلامی۔ عمدہ غزلیں ان کی طبعزاد ہیں کسی کی فرمائش پر غزل کہنے میں تامل ہوتا تھا۔ میر ایک فطرتی شاعر تھے۔ کلام میں آمد تھی آورد نہ تھی یہی وجہ ہوئی کہ شاہی دربار میں اس قدر رسوخ نہ ہو سکا جیسی کہ انہیں توقع تھی۔ طبیعت نے تکبر اور تنک مزاجی پائی تھی۔ بالآخر مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔

مولوی عبدالسلام نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میر کو قصائد پر قادر الکلامی حاصل تھی۔ لیکن بقول مولوی سید علی حیدر طباطبائی اُن کے قصائد بے مزہ اور پھیکے ہیں البتہ وہ مثنویات کے موجد اور عمدہ نمونہ ہیں۔ ان میں قدرتی انداز ہے۔ ان ہی کی بدولت مثنوی کو ترقی ہوئی۔ میر حسن اور شوق کو انھیں کا مقلد سمجھنا چاہیئے۔ باوجود اس کے یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اکثر مثنویات جن میں کتے، بلی، بکری اور مرغ وغیرہ کے قصے درج ہیں نہایت گری ہوئی ہیں۔ بعض مثنویوں میں ہندی کے ٹھیٹھ اور ثقیل الفاظ ہیں، بعض میں فحش قصے نظم ہیں۔ ان کی رباعیات اور قطعات میں بھی وہی درد و غم موجود ہے۔ اگر نصیحت بھی کرتے ہیں تو وہی حسرت آمیز۔ قطعہ

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

اور حسرت و مایوسی کا اظہار تو ہمیشہ رہتا ہی ہے

رباعی

مسجد میں تو شیخ کو خروشاں دیکھا میخانہ میں جوشِ بادہ نوشاں دیکھا
اک گوشۂ عافیت جہاں میں ہم نے دیکھا سو محلۂ خموشاں دیکھا

دیگر

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے

یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

نکات الشعرا میں خود میر نے اپنے کلام میں سے کچھ اشعار منتخب کئے ہیں ظاہر ہے کہ یہ وہ اشعار ہیں جن پر ان کو خود فخر تھا اور ان کے مایۂ ناز تھے جنھیں وہ بہترین خیال کرتے تھے۔ ان میں سے چند اشعار یہ ہیں۔

جو اس شور سے میر روتا رہے گا تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مو ندرکھنا چشم کا ہستی میں عین دید ہے کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے حباب

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں اس غمکدہ میں آہ دلِ خوش کہیں نہیں

کیونکہ کہیئے کہ اثر گریۂ مجنوں میں نہ تھا گرد نمناک ہے اب تک بھی بیابانوں کی

بعض اشعار تو اس جوش کے ہیں کہ میر کی خود پیشین گوئی کے مطابق جب تک اُردو زبان قایم ہے۔ ہمیشہ یاد رہیں گے مثلاً

مغاں جو مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہوئے گا مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے روئے گا

ابر اُٹھا تھا کعبہ سے اور جھوم پڑا میخانہ پر بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشہ اور پیمانہ پر

میر کے اکثر اشعار ضرب المثل اور زبان زد خلائق ہو گئے ہیں۔

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

ایک مشہور شعر یہ بھی ہے۔

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو اب ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

تصانیف علاوہ مثنویات کے جن کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ میر کی غزلیات چھ مکمل دیوانوں کی صورت میں ہیں۔ پانچ قصیدے چھ مخمس ترجیع بند اور ایک ہشت بند بھی ہے۔ رباعیات، قطعات، واسوخت موجود ہیں۔ فارسی کا ایک دیوان اور فارسی ہی میں ایک تذکرہ

نکات الشعرا کے نام سے جو دلی میں احمد شاہ کے زمانے میں لکھا گیا تھا، دستیاب ہے۔ لیکن اس میں نہ تو تاریخی زمانہ کے لحاظ سے کوئی ترتیب ہے اور نہ حروف تہجی کے موافق۔ فارسی میں ایک رسالہ فیض میر بھی موجود ہے جس کو حال میں مولوی مسعود حسن رضوی نے مع ترجمہ کے شایع کیا ہے۔ آخر میں جو لطیفے درج تھے اور اکثر فحش تھے اُن کو نہیں چھاپا ہے۔ سب سے زیادہ کارآمد کتاب ذکر میر ہے جس میں میر نے اپنی خود سوانح عمری فارسی میں لکھی ہے۔ اس کتاب سے میر کے حالات زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس کو شایع کرکے انجمن ترقی اُردو نے اُردو دانوں پر بڑا احسان کیا ہے۔

موازنہ میر و سودا میر و مرزا دونوں اپنے اپنے فن کے مسلّم الثبوت اُستاد تھے۔ مجموعی حیثیت سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا دشوار ہے۔ ہر ایک کسی خاص صنف شاعری میں دوسرے سے تجاوز کرجاتا ہے۔ تعلّی اور اپنی بڑائی خود کرنا اس زمانے کا عام دستور تھا اس لیئے دونوں صاحب اپنے آپ کو ریختے کے نہ صرف اُستاد بلکہ موجد قرار دیتے تھے۔ سودا نے طنزاً کہا ہے۔

جن روزوں میں حاصل تھا سخن کا اُسے کمال
تھی میر کی جب مبتذل یا نہ یہی تقریر

میر کی آشفتہ حالی کے ذکر میں لکھا جاچکا ہے کہ کچھ تو فطری تکبر اور خود پسندی کی وجہ سے دوسروں کی تعریف کرنا گوارا نہ کرسکتے تھے اور کچھ غم زدہ طبیعت کی پست ہمتی اور طبیعت میں جوش خروش نہ ہونے کی وجہ سے، پرشوکت الفاظ جو قصائد کے لیئے ضروری ہیں مہیا نہ ہوسکتے تھے۔ قصیدہ کہنے کے لیئے بلند پروازی جو بلا ہمت افزائی کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ ضروری ہے اور قصائد پر قادر الکلامی درباری ترقی کے لیئے لازم و ملزوم ہے۔ صرف رنج و غم کی کہانیوں اور ہجر کی دوامی ناکامیوں سے کچھ کام نہیں چل سکتا اسی لیئے میر کو شکستہ دل ہوکر دربار سے علحدگی اختیار کرکے گوشہ نشین ہونا پڑا۔ اس کے مقابلہ میں سودا اپنے قصائد سے درباروں میں رنگ جما چکے تھے۔ اور قصیدہ گوئی میں جو رتبہ حاصل کرچکے تھے اس کا عشر عشیر بھی میر کو میسر نہ ہوا۔ میر کے قصائد پھیکے اور مقابلتاً بے لطف ہیں۔ ان کے اشعار پست اور تعداد میں بھی کم ہیں۔ چونکہ قصیدہ درباری عزت کا ذریعہ تھا اس کی وجہ سے سودا کو شاہی دربار میں کافی عروج نصیب ہوا۔ اور میر تو اننا جیسے پھکّڑ شاعر کے مقابلہ میں بھی رسوخ حاصل نہ کرسکے اور

نہ ہجو گوئی میں کوئی کمال پیدا کیا۔ قصائد میں سودا اور میر میں وہی فرق رہا جو زمانہ مابعد میں ناسخ و آتش اور ذوق و غالب میں ہوا۔

برعکس اس کے غزل گوئی میں میر کا مرتبہ سودا سے بلند تر ہے۔ پاکیزہ اور عمدہ اشعار کہنے کے لیے عسرت، خانہ نشینی، ناکامی زندگی نہایت مفید ثابت ہوئی، درد اور نازک خیالی پیدا کرنے کے لیے مایوسی اور حسرت نے ایک کافی سرمایہ بہم پہونچایا جس نے ان کی غزلوں کو ہر دلعزیز بنا دیا سودا گوشہ نشیں یا قناعت پسند نہ تھے۔ درباری زندگی عیش سے بسر کی۔ ان کی غزلوں میں میر کا سا درد نہیں ہے۔ اور نہ زبان اس قدر سلیس اور سادی ہے۔ سودا مشکل زمینوں میں غزلیں لکھتے تھے اور زوردار الفاظ استعمال کرتے تھے جس طرح سودا کو قصائد اور قطعات میں فوقیت حاصل تھی، اسی طرح میر کو غزلیات رباعیات اور مثنویات میں۔

موازنہ کے لیے دونوں اُستادوں کے قصائد جو ایک ہی بحر و قافیہ اور ردیف میں ہیں۔ اُن کے مطلع کا ایک ایک مصرعہ درج کیا جاتا ہے ملاحظہ ہو۔

میر ، جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل

سودا ، اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل

سودا اور میر میں ایک یہ فرق بھی تھا کہ سودا زود گو شاعر تھے اور برجستہ شعر کہتے تھے۔ میر فرمایش پر اشعار کہنے میں تامل کرتے تھے۔ بقول آزاد جب ایک مرتبہ بادشاہ نے اُن سے شعر کہنے کی فرمایش کی تو ان کو ناگوار ہوا۔ ذوق نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر ٹہل ٹہل کر ایک ایک مصرع سوچا کرتے تھے۔ دربار میں فطری اور غیر فطری شاعر کا مقابلہ نہ ہوتا تھا بلکہ قصیدہ گو اور غزلخواں کا مقابلہ کیا جاتا تھا بجائے رونے کے تعلی کی زیادہ قدر تھی سید باسط علی نے میر و مرزا میں جو فرق آہ آہ اور واہ واہ کا بیان کیا ہے اور جس کو امیر مینائی نے ایک شعر میں نظم کیا ہے بالکل صحیح ہے۔ بقاء اللہ خاں بقا کا مصرع "ایک تو تو کہے ہے ایک ہے ہے" دونوں کی ہجو میں ہے۔

مشہور تذکرۂ آبِ حیات میں آزاد نے دونوں شاعروں کی طبیعتوں کے مختلف رجحان کو اُن کے اشعار سے نمایاں کیا ہے مثلاً

میر، ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام لیا
سودا، چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا صبا نے تیغ کا موج رواں سے کام لیا

ایک شعر سے آزادگی اور ناامیدی ٹپکتی ہی اور دوسرے سے بلند ہمتی اور دلیری۔

مقابلہ کے لیئے ایک ایک اور شعر جو زبان زد خلائق ہی درج کیا جاتا ہی۔

میر، سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہی
سودا، سودا کے جو بالیں پہ ہوا شور قیامت خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہی

جب تک سودا اور میر دلی میں رہے باہم اتحاد رہا۔ ایک دوسرے کو استاد بھی تسلیم کرتے تھے)

میر نہ ہو کیوں ریختہ بے سوزش و کیفیت و معنی
گیا ہو میر دیوانا رہا سودا سو مستانہ

سودا سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہی تجھکو میر سے استاد کی طرف

بعد کو یہ نوبت ہوئی کہ،

میر۔ طرف ہونا مرا مشکل ہی اب اس شعر کے فن میں
یونہی سودا کبھو ہوتا ہی سو جاہل ہی کیا جانے

سودا بھی جواب سے نہ چوکے۔

سودا۔ نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے
وہ ان طرحوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

(حقیقت میں اپنے اپنے طرز میں دونوں استاد اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ بحالت مجموعی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا نازیبا ہی)

الہ آباد ۱۵ مارچ ۱۹۳۰ء شاہ محمد سلیمان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعجازِ عشق

(۱) حمد

ثنائے جہاں آفریں ہے محال ۔۔۔ زباں اس میں جنبش کرے کیا مجال

کمالات اُس کے ہیں سب پر عیاں ۔۔۔ کرے کوئی حمد اس کی سو کیا بیاں

کہوں کیا میں اس کی صفاتِ کمال ۔۔۔ کہ ہے عقلِ کُل یاں پریشاں خیال

خرد کنہ میں اس کی حیران ہے ۔۔۔ کہاں یاں پریشاں پشیمان ہے

زمین و فلک سب ہیں اس کے حضور ۔۔۔ مہ و خور ہیں اس سے ہی لبریز نور

یہ صنعت گری اس ہی صانع سے آئے ۔۔۔ کفِ خاک کو آدمی کر دکھائے

نہ آوے کسی کی جو ادراک میں ۔۔۔ سو رکھ جاوے وہ اس کفِ خاک میں

پرے ہے گا تمثیل و تشبیہ سے ۔۔۔ منزہ ہے وہ بلکہ تنزیہ سے

وہی حاصلِ مزرعِ آسماں ۔۔۔ کیے اُن نے دانے میں خرمن نہاں

سفید و سیہ کو نہیں اس کے بار[1] ۔۔۔ دری[2] ہے زمانے کی لیل و نہار

سوا اس کے نقصاں ہے گر دیکھیے ۔۔۔ کمال اُس کے ہی ہیں جدھر دیکھیے

سر رشتہ ہے خلق کا اس کے ہاتھ ۔۔۔ وہ شب بازان پتلیوں کے ہے ساتھ

سبھوں میں نمود اُس کی ہی شان ہے ۔۔۔ یہ قالب ہیں سارے وہی جان ہے

گل و غنچہ و رنگ و بو و بہار ۔۔۔ یہ سب رنگ اللہ کے ہی ہیں یار

اگرچہ ہیں یاں سب کی طرحیں جدا ۔۔۔ یہ سب طرحیں ہیں ایک نامِ خدا

[1] بار:- دبیر۔ [2] دری:- شطرنجی۔

سما ارض و خورشید یا ماہ ہی
جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہی

نظر کر کے ٹک دیکھ ہر جا ہی وہ
نہان و عیاں سب ہیں پیدا ہی وہ

بہر صورت آئینہ ہے گا جہاں
یہ سب عکس اُس کے ہی پڑتے ہیں یاں

ملک جن و حیواں جماد و نبات
جو اُس بن ہیں تو حیف ہی کائنات

وجود و عدم اس سے دونوں ہیں شاد
وہی ہی گا مبدا وہی ہی معاد

مجھے ساقی دے کوئی جام عقیق
ولیکن لبالب ہو اس میں رحیق

رکھے آپ میں جس کی آمد مجھے
کہ در پیش ہی نعتِ احمد مجھے

نعت

ثنا جانِ پاک محمد کے تئیں
درود و تحیات احمد کے تئیں

رسولِ خدا و سرِ انبیا
زہے حشمت و جاہ صلِ علےٰ

دیا[1] مجالسِ کبریا کا ہی وہ
شرف دودمانِ قضا کا ہی وہ

سب اس صفحے میں ہیں ظہورِ خدا
پر اس سے عبارت ہی نورِ خدا

جہاں وہ ہی واں جبرئیلِ امیں
اُڑے حشر تک تو پہونچتا نہیں

کروں اُس کی قربت کا کیا میں بیاں
کہ تھا قاب قوسین او ادنےٰ مکاں

ہرا زیرِ پا اس کے فرقِ نیاز
کیا جس کی خلقت پہ صانع نے ناز

بصورت اگر عبدِ مشہود ہی
حقیقت کو پہونچو تو معبود ہی

نہیں پا شکستوں کا اب دستگیر
محمد بن اور آل بن اس کی ۔ میر

گنہگار ہوں چشم ایک اس سے ہی
توقع شفاعت کی ایک اس سے ہی

درود آل پر اُس کی ہر صبح و شام
وہ ہی شافعِ حشر و خیر الانام

پلا ساقیا بادۂ لعل گوں
کہ ہو جائیں سُرخ آنکھیں مانندِ خوں

[1] چراغ۔

ہی اب حرفِ مستانہ کا دل میں جوش
کرآویزۂ گوش گر کچھ ہی ہوش

مناجات

مرا زخم یارب نمایاں رہے
پس از مرگ صد سال خنداں رہے

رہے دشمنی جیب سے چاک کو
صبا دوست رکھے مری خاک کو

مژہ اشکِ خونیں سے سازش کرے
غمِ دل بھی مجھ پر نوازش کرے

جگر سے طپیدن موافق رہے
مرادِ دل مجھ پہ عاشق رہے

جو نالہ ہو شبگیر کا روشناس
وہ آٹھوں پہر ہی رہے میرے پاس

مژہ گرمِ افسوس و نمناک ہو
کہ سیلابِ آتش پہ خاشاک ہو

کرے نیزہ بازی یہ آہِ سحر
کہ خورشید کی پھوٹ جاوے سپر

خموشی سے مجھ کو رہے گفتگو
اُڑے پر لگا کر مرا رنگِ رو

نہ مرہم سے افسردہ ہو داغِ دل
شگفتہ رہے یہ گلِ باغِ دل

سدا چشمِ حیرت سے نسبت رہے
مجھے دیکھ رہنے کی فرصت رہے

اگر ضعف ٹک کسبِ طاقت کرے
مری ناتوانی قیامت کرے

مری بیکسی ناز بردار ہو
مروں میں تو مرنے کو تیار ہو

بیاباں میں آشفتہ حالی کروں
کہیں تو دلِ پُر کو خالی کروں

کریں دونوں عالم ملامت مجھے
ڈبو دیوے اشکِ ندامت مجھے

مرا ہاتھ ہو چاک کا دستیار
کہ تا جیب و دامن ہو قربِ جوار

جنوں میرے سر پر سلامت رہے
بیاباں میں مجھ سے قیامت رہے

بھٹکنے سے مجھکو نہ ہو وارہی[۱]
بھلا وے خضرؔ کو مری گُم رہی

جو ہو گرمِ رہ پائے پُر آبلہ
تو ہو جائے سرد آتشِ قافلہ

ارے ساقی اے غیرتِ آفتاب
کہاں تک ہمیں خونِ دل کی شراب

۱؎ رستگاری۔ خلاصی

کبھو ساغرِ بادہ کی دید ہو   محرم ہمارا کبھو عید ہو

تعریفِ عشق

زہے عشق نیرنگ سازی تری   کہ ہے کھیلنا جی پہ بازی تری
تجھی سے ہے آبِ رُخِ زرد زرد   تجھی سے مرے دل میں اُٹھتا ہے درد
تجھے ربط کفار و دیں دار سے   تجھے رشتہ تسبیح و زنّار سے
تجھی سے ہے بلبل کو نوحہ گری   تجھی پر ہے قمری بھی خاکستری
ترا جذب دریا کو بہنے نہ دے   ترا شور صحرا کو رہنے نہ دے
تجھی سے دلِ شاد غمناک ہے   تجھی سے مرا سینہ صد چاک ہے
تمنّا کو تو نے کیا ہے شہید   تجھی سے نہ بر آئی میری اُمید
تجھی سے ہے مجنون صحرا نورد   تجھی سے ہے فرہاد کوہوں پہ مرد
تجھی سے گلو بند ہے خستگی   تجھی سے ہے وابستہ دل بستگی
تجھی سے دلِ عاشقاں ہے کباب   تجھی سے ہے پروانہ آتش کا باب
ترا کام[1] دینا ہے بدنامیاں   تری ریجھ[2] دیکھے ہے ناکامیاں
تجھی سے سراسیمہ ہیں یار لوگ   تری تیغ سے قیمہ ہیں یار لوگ
تجھی میں ہیں یہ کار پردازیاں   تجھی پر ہیں موقوف جاں بازیاں
مجھے اس کے چھپنے کا سودا رہا   ولیکن ترا راز رُسوا رہا
لہو اپنا عاشق پیا ہی کیے   ترے جرم[3] پر جی دیا ہی کیے
ترا ہی نمک خوار ہے زخمِ دل   کہ مرہم سے بیزار ہے زخمِ دل
تجھے اک[4] ہی مژگاں سے یہ ربطِ اشک   کہ مشکل ہوا ہے مجھے ضبطِ اشک
کدھر ہے تو اے ساقیِ لالہ فام   یہ لغزش ہے تجھ بن کہ بہکا کلام
کہاں تک کوئی خونِ دل کو پیے   کوئی کیونکہ اس رنگ ظالم جیے

[1] تجھ سے کام پڑنا [2] تجھ پر ریجھنا، مائل ہونا۔ [3] جرمِ عشق [4] اپنی ہی معشوق کے مژگاں

قصہ بزبان راوی

نظر جا پڑی جو مری ایک سو
سرِ راہ بیٹھا تھا اک خوب رو

فقیرانہ سی جھولی اک اس کے پاس
گلے میں نہایت مکلّف لباس

سرا و پر تھا ہنگامہ اک اس کے جمع
پتنگے اکھٹے ہوں جوں گردِ شمع

لقب اس کا دیوانۂ عشق تھا
کہ شہرت میں افسانۂ عشق تھا

جوانی کے گلشن کا وہ تازہ گل
کرے جس کی خاکِ قدم غازہ گل

اسی کی سی مقدور تک سب کہیں
سدا اس کا منہ دیکھتے ہی رہیں

وہ اک دودماں کا تھا روشن چراغ
جلاتے تھے سارے اسی پر دماغ

ولے اس کے دل میں اک آتش نہاں
کہ دیجے جلا اس سے سارا جہاں

سب آرام چاہیں اسے اضطرار
سراپا تپاک اک دلِ بے قرار

نہ کچھ ہوش گھر جانے کا اس کو تھا
تشتت[۱] نہ مر جانے کا اس کو تھا

نہ طاقت تھی تن میں کچھ جی میں تاب
نہ دل پاس نَے صبر و آرام و خواب

سرِ راہ دل قیمہ قیمہ لیئے
یہ کہتا تھا مر جایئے بس جیجے[۲]

سُن اس نوگلِ عشق کی بے کلی
رہا کرتی ماتم سرا وہ گلی

دل و صبر و ہوش و توان و حواس
رہیں اس کی وحشت سے سارے اُداس

نہ ناموس کا ننگ نَے نام کا
مرا[۳] دوست دشمن تھا آرام کا

شب و روز فریاد کرنا اسے
کئی بار اک دم میں مرنا اسے

تماشے کا دیوانہ پیدا ہوا
زمانے کو چندے تماشا ہوا

جو دم لے طپش[۴] تو شتابی کرے
تسلّیِ دل کی خرابی کرے

کرے طرح[۵] داغوں سے وہ باغ کو[۶]
روانی اسی سے زرِ داغ کو

دلِ غمزدہ سے محبت اسے
قیامت خوشی سے عداوت اسے

وہ بے تابیوں سے بہت کم فراغ
کہاں صبر کرنے کا اس کو دماغ

---

۱ پریشانی، فکر ۳ راوی اس کو اپنا دوست کہکر یاد کرتا ہے ۴ بجائے "تو طپش" ۵ نمونہ بنائے ۶ کے لیے۔

اُٹھی اس کے جی سے فغاں کی شرر
رہی برچھیاں ہوتی آہِ سحر

نہ آنسو کو اس کے ہتی اُس پہ نظر
نہ آہِ سحر میں تھا اس کے اثر

کرے دیدۂ اشک افشاں پہ ناز
بدے بختِ دل رونے کی کچھ نیاز

سُنے نہ کسو کی نہ اپنی کہے
بیاں اس کا کچھ گو مگو ہی رہے

لے آ ساقی گر بادۂ شوق ہے
سیہ مستی کا ہم کو بھی ذوق ہے

کھلا چاہتا ہے گِل رازِ عشق
کہ پردے میں کب تک بجے سازِ عشق

بڑی آتشِ عشق سرکش ہے یاں
جگر کیوں نہ جل جائے آتش ہے یاں

نظر آ کہیں جا رہا ہے یہ جی
کہ آنکھوں میں اب آ رہا ہے یہ جی

زن و مرد کی ہوں زباں سے بتنگ
ہوا ہوں میں سائے قبیلے کو ننگ

سدا خونِ دل میں طپیدہ ہوں میں
کہ آہِ بلب نارسیدہ ہوں میں

تری دوری میں پہنچی ہے ای حبیب
وداعِ دمِ واپسیں بھی قریب

جگر تو ہو پانی بہا غم کے بیچ
یہ دم بھی ہوا ہے کوئی دم کے بیچ

سمجھنا یہ بھی ای مرے سر پہ خاک
کس امید پر میں ہوا ہوں ہلاک

تو جب سے درا د پر نظر آ گئی
رہیں آفتیں میرے سر پہ نئی

نہ نامہ نہ پیغام نہ رسم و راہ
یونہیں ہوتی جاتی ہے حالت تباہ

دل و دیدہ سب مدعی ہو گئے
تماشائی مجھ پہ بہت رو گئے

کئی بار جاں لب پہ آ پھر گئی
کہاں ہے تو ای گل ہوا پھر گئی

یہ حیران ہوں صبر آتا نہیں
تصوّر ترا جی سے جاتا نہیں

خراشِ جگر سے ہے چھاتی میں درد
کہ جس سے ہوا جائے ہے رنگ زرد

رہا کرتی ہے داد بے دادیاں
دلِ شب سے گزری ہے فریادیاں

سرِ رہ تک آ دیکھ یہ خستہ حال
کہ ہے نقشِ پا کی طرح پائمال

ترے دورِ غم میں تو جوں کیمیا
سنا ہی کیا نامِ مہر و وفا

نہ آنا نظر اک ادا ہی ولیک
نہ اتنا کہ جاتا رہا جی سے ایک

ترے غم میں ای آفتِ روزگار
ہزاروں بلائیں ہیں یاں لے وبکار

کہاں ہی تو محمل نشین حیا
سرِ راہ نالاں ہی میل و درا

کہاں ہی تو ای ساقیِ گلعذار
کہ دے مجھ کو جامِ مئے خوش گوار

لکھوں قصۂ عشق بے کیف و کم
قلم بے خودانہ کرے ہی رقم

مجھے آہ اک اس کے دل کی لگی
کہے تو کہ سینے میں برچھی لگی

گیا زہرۂ تابِ دل آب ہو
کہا آگے جا کر ہیں بیتاب ہو

کہ ای نازپرورد مہر و وفا
کوئی اپنے جی پر کرے ہی جفا

مثل ہی کہ جی ہی تو ہی گا جہان
وگرنہ موئے پر ہی کیا میری جان

تلف یوں نہیں جان کرتا کوئی
نہیں اس سلیقے سے مرتا کوئی

تہِ[1] دل ہو معلوم تا بول ٹک
تو مژگانِ خوں بستہ کو کھول ٹک

سخن حسرت آلود ہی کہنے پہ آ
کچھ اس دل کی باتیں زباں پر بھی لا

وگرنہ تو رک رک کے مر جائے گا
یہی عشق کام اپنا کر جائے گا

تو ہی صرصرِ عمر - آتش بجاں
دیا سا نہ بجھ جائیو ای جواں

ٹک اس شمعِ مجلس کو مہماں بلا
کہ جس مجلس افروز سے تو جلا

ترا دودِ دل یہ[2] ہوا ہی بلند
تو کس آتشِ تند پر ہی سپند

جلاتی ہی آتش تری میرے تئیں
کیا داغ کس شعلے نے تیرے تئیں

گھٹا پاتے ہیں تجھ کو ہر صبح و شام
نہ کاہیدہ ہو تو ہی ماہِ تمام

ترا درد پنہاں ہی گو آشکار
یہ مجھ سے بیاں کر کہ ہوؤں[3] رازدار

کہیں دل لگا ہو تو یہ مجھ سے کہہ
کہوں اس سے جا کر غمیں تو نہ رہ

[1] راوی کہتا ہی [2] اس قدر [3] ہوجاؤں

جہاں کو تو بھیجے وہاں جاؤں میں
کہے کام جو تو بجا لاؤں میں

جو حورِ بہشتی بھی ہو تیری یار
کروں میں تلک کی طرح واں گذار

یہ سن کر جوانِ ز خود رفتہ نے
جگر سوختہ اور دل تفتہ نے

کیا سوزِ دل کو لبوں پر نمود
زباں تاب کھانے لگی جیسے دود

سخن ہونے لاگے نمودار کچھ
لگا کرنے پیچیدہ گفتار کچھ

کہ جس سے یہ معنی ہوے مستفاد
کہ ای غمگسارِ دلِ نامراد

زبانی مری در پہ یہ جا کے کہہ
کہ احوال سے میرے غافل نہ رہ

ترے واسطے خوب رسوا ہوا
مرے سر پہ ہنگامہ برپا ہوا

تسلی شکیبائی مطلق نہیں
پر اب خوفِ تنہائی مطلق نہیں

رہی جب تلک تن میں تاب و تواں
اٹھایا تحمل کا بارِ گراں

شتابی سے دے ساقیا جامِ عشق
کہ لکھنے لگا ہوں میں پیغامِ عشق

ہوا آخراب دل کا سب خونِ ناب
پیوں کب تلک اک گلابی شراب

سراپا

سن آواز دستک کی اک تابِ حور
مہ چاردہ سے نپٹ با شعور

دو چار آکے مجھ سے ہوئی ایک بار
گیا جس کے دیکھے سے صبر و قرار

مژہ بخت عاشق کی برگشتگی
نگہ ایک عالم کی سرگشتگی

قد و قامت اس کا کروں کیا بیاں
قیامت کا ٹکڑا ہوا تھا عیاں

وہ نازاں جدھر آتی تھی اچپلی
قیامت بھی آتی جلو میں چلی

میں سودائی اس زلفِ تاریک کا
ہر اک مو سبب رنجِ باریک کا

شکن اس کی کاکل کا دامِ بلا
ہر ایک حلقۂ زلف کامِ بلا

جھولوں کی کانوں سے لگنے لطفِ ناز
الٹتی تھی اڑ اڑ کے جوں تیر باز

۱ تیغ ۲ نالہ کیا گیا۔ وجہ مفاد ۳ ختم ۴ نشست

اگر ابرو اس کی جھک جاتی تھی ۔۔۔ مہِ نو کی گردن ڈھلک جاتی تھی

ہلیں اس کے ابرو جدھر کر کے ناز ۔۔۔ کرے اس طرف ایک عالم نماز

کماں اس کے ابرو کی عاشق کمیں[۵۰] ۔۔۔ خدنگ اس کی مژگاں کے سب دلنشیں

نہ آنکھوں کی مستی کی اس کو خبر ۔۔۔ خرابی نہ عاشق کی مدِّ نظر

نگہدار تھی سُرخیِ چشم کی ۔۔۔ طرفدار تھی اپنے ہی خشم کی

شہید اس کی چشمک کے دل خستگاں ۔۔۔ نشانے نگاہوں کے دل بستگاں

مژہ موجبِ قتلِ جمعِ کثیر ۔۔۔ غرض سب تھے یہ ایک ترکش کے تیر

چھپیں اس کے غمزے میں کتنی سناں ۔۔۔ نمایاں ہوئی سب پہ مرگِ جہاں

جبیں کھول دی اس پری زاد نے ۔۔۔ کہ جبیں[۵۲] مانی خوبانِ نوشاد[۵۳] نے

رواں اس شب افروز سے اشکِ شمع ۔۔۔ یہیں سے ہے روشن کہ تھی رشکِ شمع

وہ مردوں کو زندہ دوبارا کرے ۔۔۔ مسیحا جہاں سے کنارا کرے

پری منفعل رنگِ رُخسار سے ۔۔۔ خجل کبک اندازِ رفتار سے

خضر تشنہ اس کے ہی دیدار کا ۔۔۔ مسیحا شہید اس کے بیمار کا

سوا اس کی باتوں کے سب باتیں ہیں ۔۔۔ جسے سُن کے مُردے بھی جی جاتے ہیں

غرض اور سب یونہیں کہنے کو ہیں ۔۔۔ مسیحا کے لب یونہیں کہنے کو ہیں

لبِ سُرخ اس کے وہ گل برگِ تر ۔۔۔ چھپیں جن میں دنداں کے سلکِ گہر

تبسّم میں اپنے وہ برقِ بہار ۔۔۔ دمِ حرف ہوتے گئے آب دار

دہن غنچۂ ناشگفتہ سے کم ۔۔۔ سخن رہروِ راہِ تنگِ عدم

تبسّم تنک کر وہ دلکش کرے ۔۔۔ تو گلشن میں گل صد چمن غش کرے

نہ دیکھا کسی نے جو تن اس کا صاف ۔۔۔ نظر گر نہ ٹھہرے تو کیجے معاف

کمر اس کی ممکن نہیں ہاتھ آئے ۔۔۔ مگر صاحبِ دستِ غیب اس کو پائے

نہ رنگ صفا ہی فقط تن پہ تھا
کہ مینا کا خوں اس کی گردن پہ تھا

کیا ان نے پامال فتنوں کا خوں
حنا اس کے ہاتھوں میں کتنوں کا خوں

ادا اس کی عاشق کے جی کی بلا
نہ میری تمھاری سبھی کی بلا

اگر جلوہ گر ہو وہ محشر خرام
تو معلوم ہو یہ جہاں کا قیام

خراماں خراماں جدھر آ گئی
قیامت ہی گویا ادھر آ گئی

اسے لغزشِ پا مئے ناز سے
وہ مستِ سرانداز انداز سے

نہ ہووے وہ دن جس میں ہو بے نقاب
چلا جائے پردے ہی میں آفتاب

اسی بت کا ہر اک تئیں ذکر ہے
خدا کو خدائی کی اب فکر ہے

چڑھاوے اگر ہاتھ سے آستیں
تو پھر دست موسیٰ بھی کچھ ہی نہیں

ہوئیں طرح اس سے جفا کاریاں
نکالی ہیں ان نے دل آزاریاں

ترحم کو پاؤں تلے وہ ملے
ستم اس کے کوچے سے بچ کر چلے

جو آمد ہو اس کی نصیبِ چمن
کرے ترکِ گل عندلیبِ چمن

گلی اس کی فردوس کا تھی شرف
بہشت اک گنہگار سی اک طرف

زمیں اس کی یک دشتِ گلزار تھی
نسیمِ چمن واں گرفتار تھی

گلی اس کی وہ قتل گاہِ عجیب
شہادت جہاں خضر کو ہو نصیب

وہی جائے باشِ دلِ عاشقاں
اسی پر معاشِ دلِ عاشقاں

صبا گر اُڑا دے تناک واں کی خاک
تو نکلے زمیں سے دلِ چاک چاک

کئی نعرہ کش واں گئے نعرہ زن
کئی خوں گرفتہ گئے بے کفن

کئی بے وطن واں سفر کر گئے
سسکتے ہیں کتنے کئی مر گئے

ہر اک جان ہر شخص ناکام کی
ہوا دار اس کے لبِ بام کی

پھروں گرد ساقی نشے میں ترے
گلابی ہی منہ کو لگا دے مرے

۱؎ قایم۔ بنیاد کی قایمی۔

مجھے مست آب سیہ دے کے کر
چلوں جوں قلم پھر بھی مطلب اوپر

سنا وہ جگر سوز پیغام جب
کیے آشنا حرف سے لعل لب

کہ ہجراں میں جو بے قراری کرے
سر راہ فریاد وزاری کرے

نہ سونے دے نالوں سے ہمسایہ کو
بھلی مرگ ایسے فرومایہ کو

محبت کی رہ میں وہ پھیلائے گام
کہ سر سے گذر جائے جو شاد کام

نہیں شرط الفت میں چین جبیں
اگر پیش آوے دم واپسیں

جو پھوٹا ہی پڑتا ہو جوں آبلہ
وہ ہی غم میں واماندۂ قافلہ

نہ جو ہو سکے ہجر کا پائمال
تو بہتر ہی ہوتا ہی اس کا وصال

گیا میں جواب اس سے لیکر ادھر
سر رہ تھا پامال غم وہ جدھر

حقیقت بیاں کی سب اس جائے کی
جواں نے یہ سنتے ہی اک ہائے کی

گئی ساتھ اس ہائے کے اس کی جاں
گرا خاک پر ہو کے بیدم جواں

تکے تھا مگر رہ سفر کر گیا
کہ اک بات کی بات میں مر گیا

مری بات میں خون بلبل ہوا
دیا سا وہ جلتا جو تھا گل ہوا

پلا ساقیٔ ماہ وش ایک جام
گیا کا ستن ہی میں ماہ تمام

کہاں ہی وہ خون کبوتر سی مے
کہ پی کر فغاں کیجیے مثل نے

یہ بھی جائے گر یہ ہی ساقی سنا
کہ بدلے گزک کے بھی ہی دل بھنا

تھوڑی وار دے سایۂ تاک میں
برنگ گل اب لوٹیے خاک میں

مقولہ

عجب کی نہیں جانہ کھا پیچ و تاب
یہ میر اب جو ہی عشق خانہ خراب

سنا ہی کہ فرہاد پر کیا ہوا
پھر اس عشق نے شیریں سے کیا کیا

عزا کا ہی مجنوں کی نوحہ پڑا
سیہ خیمہ لیلے کا بھی ہی کھڑا

[1] سر دیسے۔ جیسے جی سے گزرنا بمعنی جان دے دینا۔ [2] گھٹنا گھنا

گئی جان وامق کی کس رنگ سے — ہوا خاک عذرا کا سر سنگ سے
گئی آہ نل کی فلک سے اودھر — دمن سے بگولا زمیں کے اوپر
بہت عشق کی آگ میں جل گئے — بہت اُٹھتے جاتے ہیں شعلے نئے
گئی جل کے آخر پتنگوں کی جاں — چراغوں سے اگنے دل ہے کشاں
ہے بیتاب ذرّہ اسی سے کباب — جلے ہے اسی آگ میں آفتاب
دل اس داغ سے مہ کا بُھنتا ہی ہے — کتاں کا جگر چاک سِلتا ہی ہے
سیہ رنگ اُگتا ہے سرو سہی — وہی رنگ قمری ہے خاکستری
بھنور کے بھی جی پر پڑی کھل بلی — کنول کی کھلی آنکھ پر مُند گئی
کوئی نالہ بلبل سے ہے یادگار — خزاں اس چمن میں ہے گل کی بہار
کہیں ساقی دے آبِ گلرنگ کو — کشادہ بھی کر اس دلِ تنگ کو
گلے لگ کے مینا کے ٹک رو دیئے — فسانہ بھی آخر ہے اب سو رہیئے

235

شعلۂ عشق

(۲)

محبّت نے ظلمت سے کاڑھا ہی نور
نہ ہوتی محبّت نہ ہوتا ظہور

محبّت ہی علت محبّت سبب
محبّت سے آتے ہیں کارِ عجب

محبّت بن اس جا نہ آیا کوئی
محبّت سے خالی نہ پایا کوئی

محبّت ہی اس کارخانے میں ہی
محبّت سے سب کچھ زمانے میں ہی

محبّت سے سب کو ہوا ہی فراغ
محبّت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ

محبّت اگر کارپرداز ہو
دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو

محبّت ہی آبِ رُخِ کارِ دل
محبّت ہی گرمیِ آزارِ دل

محبّت عجب خوب خونریز ہی
محبّت بلائے دل آویز ہی

محبّت کی ہیں کارپردازیاں
کہ عاشق سے ہوتی ہیں جانبازیاں

محبّت کی آتش سے اخگر ہی دِل
محبّت نہ ہووے تو پتھر ہی دل

محبّت کو ہی اس گلستاں میں راہ
کلی کے دلِ تنگ میں طی ہی چاہ

محبّت ہی سے دل کو رو بیٹھیے
محبّت میں جی مفت کھو بیٹھیے

محبّت لگاتی ہی پانی میں آگ
محبّت سے ہی تیغ و گردن میں لاگ

محبّت سے ہی انتظامِ جہاں
محبّت سے گردش میں ہی آسماں

محبّت سے روتے گئے یار خوں
محبّت سے ہو ہو گیا ہی جنوں

محبّت سے آتا ہی جو کچھ کہو
محبّت سے ہو جو وہ ہرگز نہ ہو

محبّت سے پروانہ آتش بجاں
محبّت سے بلبل ہی گرمِ فغاں

اسی آگ سے شمع کو ہی گداز
اسی کے لیئے گل ہی سرگرمِ ناز

محبت سے ہی تحت سے تابفوق
زمیں آسماں سب ہیں لبریز شوق

محبت سے یاروں کے ہیں ننگ ساد
دلوں میں محبت سے اٹھتے ہیں درد

گیا قیسِ ناشاد اس عشق میں
کھپی جانِ فرہاد اس عشق میں

ہوئی اس سے شیریں کی حالت تباہ
کیا اس سے لیلیٰ نے خیمہ سیاہ

سنا ہوگا وامق پہ جو کچھ ہوا
نل اس عشق میں کس طرح سے موا

جو عذرا پہ گذرا سو مذکور ہے
دمن کا بھی احوال مشہور ہے

ستم اس بلا کے ہی سہتے گئے
سب اس عشق کو عشق کہتے گئے

اس آتش سے گرمی ہے خورشید میں
یہی ذرّے کی جانِ نومید میں

اسی سے دلِ ماہ ہے داغدار
کتانِ جگر ہے سراسر فگار

سنئے اس کے چرچے حکایت سنی
گہے شکر گاہے شکایت سنی

اسی سے قیامت ہے ہر چار اور
اسی فتنہ گر کا ہے عالم میں شور

کوئی شہر ایسا نہ دیکھا کہ واں
نہ ہو اس سے آشوبِ محشر عیاں

کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی
کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی

زمانے میں ایسا نہیں تازہ کار
غرض ہے یہ اعجوبۂ روزگار

آغازِ قصّہ

عجب کام بیٹھے میں اس سے ہوا
عجب اہل عالم کو جس سے ہوا

کہ واں اک جواں تھا بہرام نام
خوش اندام و خوش قامت و خوش خرام

جوانی کے گلشن کا وہ آب و رنگ
گلستاں پہ کام اس کی خوبی سے تنگ

جدھر نکلے رنگیں ادائی کے ساتھ
چلے جائیں جی خوش نمائی کے ساتھ

کھلے بال چلتا تھا وہ سروِ ناز
قدم بوس کو آتی عمرِ دراز

جدھر کو وہ ٹک گرمِ رفتار ہو
قیامت اُدھر سے نمودار ہو

نگہ گرم اُس کی جدھر جا لڑی
کہے تو کہ اُدھر کو بجلی گری

وہ کافر بھویں ہوویں مائل جہاں
کریں سجدہ اس جا پہ اسلامیاں

نگہ تیغ مجروح جس کی پڑے
پلک سیل جوں دل میں جا کر گرے

سیہ چشم اُس کی وہ بدمست تھی
نگاہوں سے شمشیر در دست تھی

رُخ اُس کا کہاں اور مہ و خور کہاں
تفاوت زمیں آسماں کا ہے یاں

وہ لب لعل کو جن سے شرمندگی
دمِ حرف سرمایۂ زندگی

دہن کی جو تنگی نظر کیجیے
تو آگے سخن مختصر کیجیے

نہ ہم تم زنخ دیکھ حیراں ہیں
سبھی دست زیرِ زنخداں رہیں

سراپا میں اس کے جہاں دیکھیے
وہیں روئے مقصودِ جاں دیکھیے

خراماں نکلتا وہ جس راہ سے
قیامت تھی واں نالہ و آہ سے

فدا اُس پہ تھی جان ہر ایک کا
کہ مقصودِ دل تھا بد و نیک کا

کئی گرد و پیش اُس کے وارفتگاں
کئی ایدھر اودھر جگر تفتگاں

بہت رفتگانِ ادائے کلام
بہت مبتلائے بلائے خرام

کوئی کشتہ تھا شوقِ رفتار کا
کوئی نیم جاں ذوقِ دیدار کا

کوئی والۂ خندۂ برق وش
کسی کے تئیں جنبشِ لب سے غش

کسو کی نظر میں کمر کی لچک
کسو کے جگر میں پلک کی کسک

کئی حیرتی طرزِ گفتار کے
کئی آرزو کش تھے پیکار کے

کوئی زلف سے اس کی مجنوں رہے
کسو کا تبسم سے دل خوں رہے

کوئی دل ستم کشتۂ یک نگاہ
کوئی جان ہونٹوں پہ موقوفِ آہ

کسو پر فسونِ گردشِ چشم کا
کسو پر غضب غمزہ و خشم کا

انھوں میں سے اک عاشقِ زار تھا
اس آفت سے اس کو سروکار تھا

کسی دن میں جاکر جو اُس سے ملا
کیا اُس نے حد سے زیادہ گلا

کہ ای نازنیں آہ کن نے کہا
کہ تو حال سے میرے غافل رہا

مگر سدّ رہ تھا کسو کا فریب
بلا کوئی تجھ سے بھی دشمن شکیب

کوئی زلف زنجیرِ پا ہو گئی
کہ مسدودِ راہِ وفا ہو گئی

طرح کس کی چتون کی دل میں کھُبی
جگر میں پلک شوخ کس کی چُبھی

کسی چشم نے تجھ کو جادو کیا
مرے جامِ عشرت کو لوہو کیا

کہا اُن[1] نے تھی کد خدائی مری
نہ تھی بے سبب یہ جدائی مری

نہ فرصت مجھے صبح ہو اب نہ شام
طرف اُس کے ہی دل کو میلِ تمام

اُسے بھی مرے ساتھ اخلاص ہی
دلوں کو بہم رابطہ خاص ہی

اُسے مجھ سے ہی نسبتِ عاشقی
وہ رہتی ہی بے طاقتِ عاشقی

نہیں اُس کو یک لحظہ تابِ فراق
جدائی مری اُس پہ گزرے ہی شاق

نکلتا ہوں گھر سے جو میں ایک آن
تو پاتا ہوں جاکر اُسے نیم جان

نہ دیکھے جو مجھ کو تو مرجائے وہ
وہیں جی سے اپنے گزر جائے وہ

جو پہونچے مری جھوٹ اُسے بد خبر
تو کر بیٹھے ہیچ اپنے جی کا ضرر

غرض اُس کو تاب و تحمل نہیں
شکیبائی ہجر بالکل نہیں

یہ سُن کر کہا اُس دل افگار نے
ستم کُشتۂ دوریِ یار نے

کہ مجھ کو نہیں تیری باتیں قبول
یہ مکرِ زناں ہیں تو ان پر نہ بھول

وفا کننے ان ناقصوں میں سے کی
موا شوے کس کا کہ وہ پھر نہ جی

یہ ظاہر میں ہر چند ہوں رشکِ ماہ
ولیکن ہیں باطن میں مارِ سیاہ

خدا مکر سے ان کے دے ہی خبر
نہیں اُن سے کوئی فریبندہ تر

جہاں میں فریب ان کا مشہور ہی
زبانوں پہ مکر ان کا مذکور ہی

[1] پرسرام۔

پئے امتحاں عاقبت یک نفر
مقرر ہوا تا کہ جاوے اُس کے گھر

کہے "غرقِ دریا ہوا پرسرام
ہوئی زندگانی کی صبح اس کی شام

گیا تھا نہانے کو وقتِ سحر
سو ڈوبا وہ خورشیدِ روشن گہر

گیا موجِ دریا نے سر سے گزار
اُٹھا طبعِ نازک سے اس کے غبار

وہ گیسو جو بکھرے تھے بالائے آب
سو اب موجِ دریا کو ہے پیچ و تاب

پھریں تھیں جو وے انکھڑیاں آب میں
ہووے گم وہیں اب ہیں گرداب میں

تمنا ہیں تھے جس کی سب دل فگار
سو دریا کو اب ہے وہ بوس و کنار"

نہ سمجھا وہ نافہم[1] اسرارِ عشق
نہ سوچا وہ ناتجربہ کارِ عشق

کہا غرقِ دریا ہوا پرسرام
ہوا کام اس رشکِ مہ کا تمام

کہے تو کہ موجوں کو تھا انتظار
کہ وے دست و بغل ہو گئیں ایک بار

گیا بیٹھ پانی میں ایسا شتاب
کہ گویا لبِ آب کا تھا حباب

کنارے پہ دریا کے اک شور ہے
بحالِ تباہ ایک جمہور ہے

کوئی سر پر اس غم سے ڈالے ہے خاک
کسی نے کیا ہے گریبان چاک

سنا اُس کے ہمسر نے جب یہ سخن
ہوا موجزن بحرِ رنج و محن

گری ہو کے بے جاں وہ زرومند[2]
ہوا شورِ نوحہ کا گھر سے بلند

وہ آیا جو تھا دل پریشاں گیا
کہ اس واقعے سے پشیماں گیا

خبر لے گیا اُس کنے زود تر
جو تھا درپئے امتحاں بے خبر

گیا ہوش سُن کر پرسرام کا
دوانہ ہوا عشق کے کام کا

اُٹھا بے خود و بے خرد بے حواس
گرا آکے اس پیکرِ مردہ پاس

لگا کہنے اے مایۂ زندگی
مجھے منہ سے تیرے ہے شرمندگی

گیا جلد رختِ سفر تو نے بار
نہ میرا کیا آہ تک انتظار

۱؎ پیغامبر جو یہ خبر لیکر گیا۔ ۲؎ پرسرام کی زوجہ

نہ میری سنی کچھ نہ اپنی کہی
مرے تیرے دونوں کے جی میں رہی

زمیں پر سے آخر اٹھایا اسے
لبِ آب جا کر جلایا اسے

جب آگ اس کے پیکر پہ سب چھا گئی
محبت عجب داغ دکھلا گئی

یہ سرگرم فریاد و زاری ہوا
لہو اس کی آنکھوں سے جاری ہوا

جگر غم میں یک لخت خوں ہو گیا
رکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا

گئے ہوش و صبر اس کے یکبارگی
طبیعت میں آئی اک آوارگی

سراسیمگی سے بگولا ہوا
پھرے اس طرح جیسے بھولا ہوا

نہ جی کو تسلی نہ دل کو قرار
کفِ غم میں سررشتۂ اختیار

کبھو یاد کر اس کو نالاں رہے
کبھو ٹک جو بھولے تو حیراں رہے

کبھو یاں کبھو واں بحالِ خراب
وہی بے قراری وہی اضطراب

رہے گھر تو آشوب گہ وہ گلی
چمن میں جو لے جائیں تو بیکلی

کبھو متصل ہونٹھ پر آہ سرد
کبھو دست بر دل کہ دل میں ہے درد

ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد
لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد

کچھ اپنے بد و نیک کی سدھ نہیں
نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں

کبھو جا کے صحرا سے لاویں اسے
کبھو روتے دریا پہ پاویں اسے

کبھو خاک ملتا ہے منھ پر کھڑا
کہیں ہے خرابی میں بے سدھ پڑا

کنارے پہ رہتا تھا اک دام دار
رہا رات اس کے یہ قرب و جوار

کہا اس کی عورت نے اس رات کو
نہیں تجھ سے جی چاہتا بات کو

تجھے فکر کچھ اب ہمارا بھی نہیں
تو جاتا نہیں شام سے اب کہیں

ترا شب کو دریا میں پڑتا تھا دام
تو چلتا تھا بارے معیشت کا کام

وہ بولا کہ میں بھی پریشان ہوں
بہت تنگ دستی سے حیران ہوں

کہ یک شعلۂ تند پر پیچ و تاب
فلک سے اترتا ہے نزدیکِ آب

ٹھہرتا جو ہے پھر کنارے پہ واں
کہے ہے "پرسرام تو ہے کہاں"

سنا حال شعلے کا صیاد سے
دھواں اک اٹھا جان ناشاد سے

کیاں عقل کی اُن نے باتیں جو واں
وہ عاشق جو تھا درپئے امتحاں[۵]

لگا کہنے یہ آرزو تھی مجھے
کہ اک روز ہشیار دیکھوں تجھے

مقرر کیا ہے کئی دن سے یہ
کہ آئندہ رہیئے تری خاکِ رہ

جو اس میں ہے خوشتر تو ہوں میں بھی تیّار
رہیں گے لب آب ہی آج رات

ہوئے عاقبت سوئے دریا رواں
نہ پیدا کسو پر یہ رازِ نہاں

ہوئے ناؤ پر شام کو جب سوار
کہا ان نے یاں ایک ہے دام دار

اسے سات لو تو بڑی بات ہے
کہ دریا میں پھرتا ہے اور رات ہے

لیا آخر الامر ہمرہ اُسے
بٹھایا قریب اپنے یہ کہہ اُسے

کہاں شعلۂ سرکش آتا ہے یاں
کدھر پیچ و تاب آکے کھاتا ہے یاں

یہ صیاد سے تھا ہی محوِ سراغ
جگر آتشِ شوق رکھتی تھی داغ

کہ ہو کر فروغ اک سوئے آسماں
تڑپنے لگا جیسے آتش بجاں

پکارا "کہاں ہے پرسرام تو
محبّت کا ٹک دیکھ انجام تو

کہ ہیں جملہ تن آتش تیز ہوں
دل گرم سے شعلہ انگیز ہوں

بھڑکتی ہے جب آگ دل کی مرے
لب آب اُتروں ہوں غم میں ترے

مگر سوزشِ دل ہو کم آب سے
تجھے جی مرا اس تپ و تاب سے

سو یہ آب رکھتا ہے روغن کا کام
کیا عشق نے آہ دشمن کا کام"

یہ بیتاب سن کر ہوا بے قرار
سفینے سے اُترا بصد اضطرار

ہوا ہمدم اس آتش انگیز سے
کہا اس بلا سے دل آویز سے

[۵] یعنی پرسرام نے اس واقعہ کے بعد جب ہوش حواس کی باتیں کیں "کیاں" ۔ کیں ۔ [۵] درپئے امتحاں :۔ امتحان دینے کی کوشش میں تھا۔

کہیں ہوں پر اسرام خانہ خراب — مرا دل بھی اس آگ سے ہے کباب
مرے بھی جگر میں یہی سوز ہے — یہی مجھ کو جلنا شب و روز ہے
محبت تری برقِ خرمن ہوئی — تری دشمنی جی کی دشمن ہوئی
سخن مختصر کچھ وہ شعلہ چلا — کچھ اک اپنی جاگہ سے یہ دل جلا
بہم گرمجوشی سے یک جا ہوئے — کہ گذری تھی مدت بھی تنہا ہوئے
وہ شعلہ رہا ایک جا مشتعل — کہے تو تسلی ہوئے جان و دل
یکایک بھڑک کر وہ جلنے لگا — پھرا ایدھر اودھر پھرنے چلنے لگا
گیا پاس پانی کے آکر صعود — رہی روشنی سے کوئی دم نمود
پھر آگے کسو پر نہ پیدا ہوا — نہ جانا کہ وہ شعلہ پھر کیا ہوا
اٹھے ڈھونڈنے ہو کے سب ناصبور — کنارے پہ دریا کے نزدیک و دور
نہ پایا کہیں اس کو حیراں ہوئے — نہایت ہی خاطر پریشاں ہوئے
محبت نے ایسا کھپایا اسے — کہ ہرگز کنھوں نے نہ پایا اسے
پھرے خوار ہو ہو کے ناچار سب — کسی کو تحیر کسی کو عجب
کوئی منفعل ساتھ آنے سے تھا — کوئی برلبِ آب جلنے سے تھا

مقولہ شاعر

اگرچہ یہ قصہ بھی حیرت فزا — ولے پھر یہ عشق ہے یہ بلا
بہت جی جلائے ہیں اس عشق نے — بہت گھر لٹائے ہیں اس عشق نے
فسانوں سے اس کے لبالب ہے دہر — جلائے ہیں اس تند آتش نے شہر

محبت نہ ہو کاش مخلوق کو
نہ چھوڑے یہ عاشق نہ معشوق کو

دریائے عشق

(۱۳)

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال | ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا | کہیں سینے میں آہِ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا | کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا | کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
گہہ نمک اس کو داغ کا پایا | گہہ پتنگا چراغ کا پایا
واں طپیدن ہوا جگر کے بیچ | یاں تبسم ہے زخمِ تر کے بیچ
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے | کہیں یہ خونچکاں شکایت ہے
تھا کسی دل میں نالۂ جانکاہ | ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ
تھا کسو کی پلک کی نمناکی | ہے کسو خاطروں کی غمناکی
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا | کہیں موجب شکستہ رنگی کا
کہیں اندوہِ جانِ آگہ تھا | سوزشِ سینہ ایک جاگہ تھا
کہیں عشاق کی نیاز ہوا | کہیں اندوہِ جاں گداز ہوا
ہے کہیں دل جگر کی بے تابی | تھا کسو مضطرب کی بے خوابی
کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا | کسو محمل کے آگے گرد ہوا
طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا | بے ستوں میں شرارِ تیشہ رہا
کہیں بے بست[۱] کو لگائی آگ | کہیں تیغ و گلو میں رکھی لاگ
کبھو افغانِ[۲] مرغِ گلشن تھا | کبھو قمری کا طوقِ گردن تھا
کسو مسلخ[۳] میں جا فسارہ[۴] ہوا | کوئی دل ہو کے پارہ پارہ ہوا

۱ بست: اپیچر علم نغان۔ ۲ فغان ۳ مذبح ۴ رسی یا میخ جس میں قصاب ذبح کیے ہوئے جانور کو ٹانگتے ہیں۔

ایک عالم میں درد مندی کی　　ایک محفل میں جا سپندی کی

ایک دل سے اُٹھے ہی ہو گرد ود　　ایک لب پر سخن ہی خوں آلود

اک زمانے میں دل کی خواہش تھا　　ایک سینے میں جگر کی کاہش تھا

کہیں بیٹھے ہی جی میں ہو کر چاہ　　کہیں رہتا ہی قتل تک ہمراہ

خارِ خارِ دلِ غریباں ہی　　انتظارِ بلا نصیباں ہی

کہیں شیون ہی اہلِ ماتم کا　　کہیں نوحہ ہی جانِ پر غم کا

آرزو تھا اُمیدواروں کی　　درد مندی جگر فگاروں کی

نمکِ زخمِ سینہ ریشاں ہی　　نگہِ نازِ مہر کیشاں ہی

حسرت آلودہ آہ تھا یہ کہیں　　شوق کی یک نگاہ تھا یہ کہیں

کِشش اس کی ہی ایک عجوبہ　　ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا

کون محرومِ وصل یاں سے گیا　　کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا

کام میں اپنے عشق یکتا ہی　　ہاں یہ نیرنگ ساز یکتا ہی

جس کو ہو اس کی التفات نصیب　　ہی وہ مہمانِ چند روزہ غریب

ایسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہی　　کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہی

قصّہ

ایک جا اک جوانِ رعنا تھا　　لالہ رخسار سرو بالا تھا

عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم　　دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم

شوق تھا اس کو صورتِ خوش سے　　اُنس رکھتا تھا وضعِ دلکش سے

تھا طرحدار آپ بھی لیکن　　رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن

کوئی ترکیب اگر نظر آتی　　صورتِ حال اور ہو جاتی

دیکھتا گر وہ کوئی خوش پرکار　　رہتا خمیازہ کش ہی لیل ونہار

سلہ سبتی یکتا

زلف ہوتی کسو کی گر برہم — دیکھتے ہیں کے حال کو درہم
دیکھتا گر کہیں وہ چشمِ سیاہ — دل سے بے اختیار کرتا آہ
سر میں تھا شوق شوق دل میں تھا — عشق ہی اُس کے آب و گِل میں تھا
الغرض وہ جوانِ خوش اسلوب — ناشکیبا رہے تھا بے محبوب
ایک دن بے کلی سے گھبرایا — سیر کرنے کو باغ میں آیا
کسو گل پاس وہ صنم ٹھہرا — کہیں سبزے میں ایک دم ٹھہرا
اِک خیابان میں سے ہو نکلا — ایک سائے تلے سے رو نکلا
نہ تسلّی ہوا دلِ بے تاب — نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب
دل کی واشد سے بے توقع ہو — ہر شجر کے تلے بہت سا رو
دیکھ گلشن کو نااُمیدانہ — منھ کیا اُن نے جانبِ خانہ
دل کے رُکنے کا اُس کو اک غم تھا — راہ چلنے میں حال درہم تھا
ناگہ اک کوچے سے گزار ہوا — آفتِ تازہ سے دوچار ہوا
ایک غرفے سے ایک مہ پارا — تھی طرف اُس کے گرمِ نظارہ
پڑ گئی اُس پہ اک نظر اُس کی — پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی — وہ نظر بھی وداعِ طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بے قراری نے کج ادائی کی — تاب و طاقت نے بے وفائی کی
مُنھ جو اُس کا طرف سے اس کے پھرا — مضطرب ہو کے خاک پر یہ گرا
وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اس کا — بے طرح ہووے گو کہ حال اس کا
جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ — اُٹھ گئی سامنے سے یک بارہ
وہ گئی اس کے سر بلا آئی — خاک میں مل گئی وہ رعنائی

دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز
رنگ چہرے سے کر چلا پرواز

ہاتھ جانے لگا گریباں تک
چاک کے پھیلے پاؤں داماں تک

طبع نے اک جنوں کیا پیدا
اشک نے رنگِ خون کیا پیدا

سوزشِ دل نے جی میں جاگہ کی
داغ نے آ جگر کو آتش دی

بسترِ خاک پر گرا وہ زار
درد کا گھر ہوا دلِ بیمار

خاطرِ افگار خار خار ہوئی
جانِ تمناکشِ نگار ہوئی

اُس[1] کے منہ پر پڑی جو اِس[2] کی نگاہ
ناامیدی کے ساتھ سر کی آہ

خود ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ
رابطہ آہِ آتشیں کے ساتھ

ہونٹھ سوکھے تو خونِ ناب ملا
خواب و خور دونوں کو جواب ملا

خلق اس کی ہوئی تماشائی
پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی

کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے
رو دیا اُن نے ایک حسرت سے

جا کے اُس کے قریب در بیٹھا
قصد مرنے کا اپنے کر بیٹھا

دل نے مجبورِ اضطراب کیا
شوق نے کام کو خراب کیا

جو کہ سمجھے تھے اُس کو دیوانہ
رحم کرتے تھے آشنا یانہ

عاشق اُس کو کسو کا جان گئے
سب بُرا اس ادا سے مان گئے

وارث اُس کے بھی بدگمان ہوئے
درپئے دشمنیِ جان ہوئے

پھر یہ ٹھہری کہ ہوں گے ہم بدنام
سُن کے آخر کہیں گے خاص و عام

کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا
کن نے مارا اُسے کہاں مارا

دے کے دیوانہ اُس جواں کو قرار
ہو گئے سارے درپئے آزار

ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا
ایک نے آ کے زیرِ سنگ کیا

ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر
ایک بولا کہ اب ہو کیا تاخیر

[1] عاشق کی - [2] محبوبہ کی۔

کی اشارت کہ کو دکانِ شہر
آئے لبریز غصہ و پر قہر

گرچہ ہنگامہ اُس کے سر پر تھا
لیک روے دل اُس کا اودھر تھا

محو تھا اُس کے یہ خیال کے بیچ
تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ

ہونٹھ پر حسن کا بیان اُس کا
تھا سر و سنگ آستان اُس کا

ایک دم آہ سرد بھر اُٹھنا
نالۂ گرم گاہ کر اُٹھنا

جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے
اس طرف ایک نگاہ مشکل ہے

دوست کو میرے نام سے ہے ننگ
دشمنوں سے ہے جی پہ عرصہ تنگ

چشم تر سے لہو بہا کرنا
صبح کی باد سے کہا کرنا

کاے نسیم سحر یہ اُس سے کہہ
مت تغافل کر اور غافل رہ

ان بلاؤں میں کوئی کیونکہ جیئے
جان پر آبنی ہے تیرے لیئے

جان دوں تیرے واسطے سو تو
آنکھ اُٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو

رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی
دور پہونچی ہے میری رسوائی

نام کو بھی ترے نہ جانا آہ
تجھ سے کیونکر سخن کی نکلے راہ

ناامیدانہ گر کروں ہوں نگاہ
دیکھتا ہوں ہزار روزِ سیاہ

سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد
ایک میں خوں گرفتہ سو جلاد

کوئی مشفق نہیں کہ ہووے شفیق
بیکسی بن نہیں ہے کوئی رفیق

نالہ ہوتا ہے گہہ گہے دل جو
گریہ آنسو سے پونچھتا ہے کبھو

آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے
اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

چشم رکھتا ہے وصل کی پہ دل
جی ہے اس سے اسیر آب و گل

ورنہ ترکیب یہ کہاں ہوتی
صورت اک معنیِ نہاں ہوتی

اب ٹھہرتا نہیں ہے پاے ثبات
ایک میں اور کتنے تصدیعات

سنگِ باراں سے سخت ہیں وہ تنگ — شیشۂ دل نہیں ہی پارۂ سنگ
مجرم یک نگاہ بیش نہیں — کم ہی سینے میں جا کہ ریش نہیں
کیونکہ کہیے کہ تو نہیں آگاہ — اک قیامت بپا ہی یاں سرِ راہ
کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز — اک جہاں اس سے ہی خبر پرداز
بس تغافل ہوا ترحم کر — گوشِ دل جانبِ تظلّم کر
کون کہتا ہی رہ نہ مجھ ناز — پر نہ اتنا کہ جی سے جاوے نیاز
جب ہوا ذکر اقل و اکثر میں — چاہ ثابت ہوئی اسی گھر میں
سب محافے میں اُس کو کر کے سوار — ساتھ دی ایک دایۂ غدار
پار دریا کے جلد رخصت کی — اس طرح فکرِ رفعِ تہمت کی
گھر سے باہر محافہ جب نکلا — اس جواں پاس ہو کے تب نکلا
طپشِ دل سے ہو کے یہ آگاہ — ہو لیا ساتھ اُس کے بھر کر آہ
قطرہ زن اشک سا وہ راہ تمام — در پئے راہ تھا یہ بے آرام
ہر قدم تھا زبان پر جاری — خواب ہی یہ کہ ہی یہ بیداری
ہمسری اس کی تھی میسّر کب — ہی مجھے بخت واژگوں سے عجب
شوق مفرط نے بے رہی کی سخت — تو شکیبی نے دل سے باندھا رخت
رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے — اُڑنے لاگے جگر کے پرکالے
اضطرابِ دلی نے زور کیا — ان نے بے اختیار شور کیا
دل کے غم کو زبان پر لایا — آفتِ تازہ جان پر لایا
کاے جفا پیشہ و تغافل کیش — اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش
منھ چھپایا ہی تو نے اس پر بھی — نگہِ التفات ایدھر بھی
صبر کس کس بلا سے کر گزروں — چارہ اس بن نہیں کہ مر گزروں

منزلِ وصل دور ہیں کم پا[1]
تجھ کو اس مرتبے ہیں استغنا

ہے تو نزدیک دل سے اے طناز
لیک تجھ تک سفر ہے دور و دراز

ناز نے یک نفس نہ رخصت دی
آئینے نے تجھے نہ فرصت دی

تو تو واں زلف کو بنایا کی
جان یاں پیچ و تاب کھایا کی

تجھ کو تھی اپنے خال رخ پہ نگاہ
دل مرا مبتلائے داغِ سیاہ

تجھ کو مدِ نظر تھی اپنی چال
میں ستمکش ہوا کیا پامال

بسترِ خواب پر تجھے آرام
مجھ کو خمیازہ کھینچنے سے ہے کام

واں لبِ لعل تیرے خنداں تھے
یاں فسردہ جگر پہ دنداں تھے

ناز[1] و خوبی نے دل دیا نہ تجھے
رحم سے آشنا کیا نہ تجھے

اب تغافل نہ کر تلطف کر
حال پر میرے ٹک تاسف کر

آب کیسا کہ بحر تھا ذخار
تند و مواج و تیرہ و تہ دار[2]

موج کا ہر کنا یہ طوفاں پر
مارے چشمک حبابِ عماں پر

ہمکنارِ بلا ہر اک گرداب
لجہ سرمایہ بخشِ تیرہ سحاب

گزرِ موج جب نہ تب دیکھا
ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا

کشتی اک آن کر ہوئی موجود
ہو فلک سے ہلال جیسے نمود

کی کنارے پہ لا کے استادہ
تھا محافہ رکوب آمادہ

اس سفینے میں جلد جا پہونچا
یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہونچا

بیچ دریا کے وا یہ نے جا کر
کفش اس گل کی اس کو دکھلا کر

پھینکی پانی کی سطح پر یکبار
اور بولی کہ او جگر افگار

حیف تیری نگار کی پاپوش
موجِ دریا سے ہووے ہم آغوش

غیرتِ عشق ہے تو لا اس کو
چھوڑ مت یوں برہنہ پا اس کو

[1] کوتاہ قدم۔ کم چلنے والا۔ [2] بہت گہرا

سُن کے یہ حرفِ دایۂ مکّار
دل سے اس کے گیا شکیب و قرار

بے خبر کارِ عشق کی تہ سے
جست کی اُن نے اپنی جاگہ سے

تھا سفینے میں یا کہ دریا میں
موجِ زنجیر ہو گئی پا میں

کھچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب
تھی کشش عشق کی مگر تہِ آب

کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں
ڈوبے ایسے کوئی نکلتے ہیں

ڈوبے جو یاں کہیں وہ جا نکلے
غرقِ دریائے عشق کیا نکلے

عشق نے آہ کھو دیا اس کو
آخر آخر ڈبو دیا اس کو

دایۂ حیلہ گر ہوئی دل شاد
واں سے کشتی چلی برنگِ باد

یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے
فتنہ سازی میں اک قیامت ہے

خاک ہو کیوں نہ عاشقِ بیدل
کام سے اپنے یہ نہیں غافل

وصل جیتے نہ ہو میسّر اگر
لاوے معشوق کو یہ تربت پر

یاں سے عاشق اگر گئے ناشاد
خاکِ خوباں بھی ان نے کی برباد

قصّہ کوتاہ بعد یک ہفتہ
آئی وہ رشکِ مہ زخود رفتہ

کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ
ہو گیا غرق وہ فرومایہ

اب تو وہ تنگ[1] درمیاں سے گیا
آرزومند اس جہاں سے گیا

تھے جو ہنگامے اس کے حد سے زیاد
ساتھ اُس کے گئے وہ شور و فساد

شور و فتنے تھے اس تلک سارے
اب تو بدنامیاں نہیں بارے

دل تڑپتا ہے متّصل میرا
مرغِ بسمل ہے یا کہ دل میرا

وحشتِ طبع اب تو افزوں ہے
حال جی کا مرے دگرگوں ہے

بے دماغی کمال ہوتی ہے
جان تن کی وبال ہوتی ہے

دِل کوئی دم کو خون ہووے گا
آج کل میں جنون ہووے گا

[1] عاجز ہوکر

بے کلی جی کو تاب دیتی ہے / طاقتِ دل جواب دیتی ہے
جی میں آتا ہے ہوں بیابانی / پر کہوں ہوں کہ ہے یہ نادانی
مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر / ایک دو دم رہیں گے دریا پر
گاہ باشد کہ دل مرا وا ہو / ورنہ کیا جانیے کہ پھر کیا ہو
یہ نہ سوچی کہ بد بلا ہے عشق / گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق
جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے / عاقبت اس کو مار رکھتا ہے
جذب سے اپنے جب کسے ہے کام / عاشق مردہ سے بھی لے ہے کام
صبح گاہاں وہ غیرتِ خورشید / اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
پہونچی نصف النہار دریا پر / روئے بے اختیار دریا پر
حد سے افزوں جو بے قرار ہوئی / دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ / یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
مکر میں گرچہ دایہ تھی کامل / لیک تہہ سے سخن کی تھی غافل
یہ نہ سمجھی کہ ہے فریبِ عشق / ہے یہ مہ پارہ ناشکیبِ عشق
بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف / یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کر / گر پڑی قصدِ ترک جاں کر کر
موج ہر یک کمند شوق تھی آہ / لپٹی اس کو برنگِ مارِ سیاہ
دام گستر وہ عشق تھا تہہ آب / جس کے حلقے تمام تھے گرداب
حسن موجوں میں یوں نظر آوے / نور مہتاب جس سے لہراوے
تھیں وہ اس کی حنائی انگشتاں / غیرت افزائے پنجۂ مرجاں
سر پہ جس دم وہ آب ہو کے بہا / سطح پانی کا آئنہ سا رہا
کششِ عشق آخر اس مہ کو / لے گئی کھینچتی ہوئی تہہ کو

کودے غواص و آشنا سارے　　تا بمقدور دست و پا مارے
کھینچ کے کوفت سب ہوئے بیتاب　　نہ لگا ہاتھ وہ دُرِ نایاب
جا بہم آغوش مردہ یار ہوئی　　تہ میں دریا کے ہم کنار ہوئی
پاک کی زندگی کی آلایش　　ہو کے دست و بغل کی آسایش
نکلے باہر و لے موئے نکلے　　دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربطِ چسپاں بہم ہویدا تھا　　مر گئے پر بھی شوق پیدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بائیں[۱]　　ایک کے لب سے ایک کو تسکیں
جو نظر ان کو آن کرتے تھے　　ایک قالب گمان کرتے تھے
کیا لکھوں مل رہے وہ وصلی وار　　ہم دگر سے جدا ہوئے دُشوار
کیوں نہ دُشوار ہوئے ان کا فصل　　جان دے دے ہوا ہو جن کا وصل
حیرتِ کارِ عشق سے مردم　　شکلِ تصویر آپ میں تھے گم

مقولہ

میر اب شاعری کو کر موقوف　　عشق ہی ایک فتنۂ معروف
قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے　　اسے جو تو کہے سو آتا ہے
کتنی وسعت ترے بیاں میں ہے　　کتنی طاقت تری زباں میں ہے
لب پہ اب مہرِ خامشی بہتر　　یاں سخن کی فرامشی بہتر

[۱] زیر سر

جوش عشق

(۴)

ضبط کروں میں کب تک آہ اب
چل اے خامے بسم اللہ اب

کہہ تک دل کا رازِ نہانی
ثبتِ جریدہ میری زبانی

یعنی میرا ایک خستۂ غم تھا
سرتاپا اندوہ و الم تھا

آنکھ لڑی اس کی اک جاگہ
بیخود ہو گئی جانِ آگہ

صبر نے چاہی دل سے رخصت
تاب نے ڈھونڈی ایک دم فرصت

تاب و توان و شکیب و تحمل
رخصت اس سے ہو گئے بالکل

سینہ فگاری سامنے آئی
بیتابی نے طاقت پائی

گھرتے آئے داغِ سیاہی
کام جگر کا کرنے تباہی

خون جگر ہو بہنے لاگا
پلکوں ہی پر رہنے لاگا

خواب و خورش کا نام نہ آیا
ایک گھڑی آرام نہ آیا

چاکِ جگر سے محبّت ٹپکی
آنسو کی جاگہ حسرت ٹپکی

سوز سے چھاتی تابہ گویا
اور پلک خوں نابہ گویا

آہ سے اس کی مشکل جینا
درد فقط تھا سارا سینہ

دل میں تمنّا۔ داغ جگر میں
شیون لب پر۔ یاس نظر میں

نالے شب کو اس کے سُن کر
مر گئے کتنے سر کو دُھن کر

آہ و فغاں ہی اُس کے لب پہ
روز ہی ہی ایک آفت سب پہ

رو و جبیں پہ خراشِ ناخن
داغوں سے خوں کے قامت گلبن

زخمِ سینہ دل تک پہنچا
کوئی نہ اس گھائل تک پہنچا

آبلہ دل کا جب کوئی پھوٹا
غم نے تو دل میں کیا ہی چھوڑا
سوئے[1] گیا یک دم وہ بے کل
کام رہا ناکامی ہی سے
رخساروں پر خوں رواں ہو
دشنۂ غم سے سینہ کو چاچا
دِل آماجگہِ غمناکی
نے طاقت نے یارا اس کو
نالۂ دل میں حزینی اس کے
رنگ اُڑے چہرے کا ہر دم
دست بدل ہر آن رہے وہ
رنگ شکستہ بس کہ فسردہ
خوں باری سے چہرہ گلگوں
جادۂ[2] دلِ جاری چاک گریباں
دیدۂ تر سے دریا قائل
ہر دم ہو ہر سمت کو جاری
تشنہ لبی اک منھ پر پیدا
خاک بسر آشفتہ سری سے
سرتا پا آشفتہ دماغی
غم سے گرچہ دم بھی کہیں تھا
رَو[4] دی پر جب اپنی آوے

فوّارہ لوہو کا چھوٹا
بر میں تھا ایک پکّا پھوڑا
بخت نہ جاگے اس کے اک پل
تسکین سب بے آرامی ہی سے
دل میں ہو سو منھ پہ عیاں ہو
ناخن سے منھ سارا نوچا
اور نفس اک تیرِ خاکی
ضعفِ دلی نے مارا اس کو
خاطر میں غمگینی اُس کے
تھا گویا گلِ آخر موسم
بے طاقت بے جان رہے وہ
کہنے کو زندہ لیکن مردہ
حلقِ بسمل دیدۂ پر خوں
گوشۂ دامن واقفِ مژگاں
ساحل خشک لبی کے سائل
خون باری سے سیلِ[3] بہاری
لب چش جس کا ہووے نہ دریا
شورِ قیامت نوحہ گری سے
داغِ جنوں دے جس کو چراغی
جامے میں اک تار نہیں تھا
صحرا صحرا خاک اُڑاوے

[1] سویا نہیں [2] ختم نہ ہونے والی لکیر۔ [3] بہار کا ابلا۔ [4] اُمنگ۔ موج۔

کلفتِ دل جب خاک فشاں ہو
اشک کی جاگہ ریگِ رواں ہو

گل ان نے از بس کہ کھائے
پھولوں کی چھڑیاں ہاتھ بنائے

دل کے غبار نے راہ جو پائی
شہر میں گویا آندھی آئی

سر پر اس کے سنگ ہمیشہ
جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ

آہ سرد کرے وہ عریاں
بید سا کانپے موئے پریشاں

گرد کی تہ اس کا پیراہن
دامنِ صحرا جس کا دامن

بارِ دامن تارِ گریباں
دامن قربِ جوارِ گریباں

پامالی میں مثلِ جادہ
نقشِ قدم سا خاک فتادہ

دشت تلک گئی آبلہ پائی
دور کھنچی اس کی رسوائی

اس کے جو پامال ہوئے سب
خارِ بیاباں لال ہوئے سب

جن نے دیکھا اس کو یک دم
اس نے کہا یہ بھول کے سب غم

چندے یہ ناشاد رہے گا
پر مدت تک یاد رہے گا

جلنا اس سے کرے کنارا
جیسے چراغِ وقف بچارا

لوہو ٹپکے آہِ سحر سے
نالہ گھٹواں لختِ جگر سے

رکھتا سدا تھا وہ دیوانا
وردِ زبانِ یہ شعرِ دانا

صار فوادی شقا شقا
حقا حقا حقا حقا

ہوش و خرد ناشاد گئے سب
دین و دل برباد گئے سب

وردِ دل سے کچھ نہ کہے وہ
ہر ایک کا منھ دیکھ رہے وہ

حسرت اس کی اک عجوبہ
آبِ دہن کی موج میں ڈوبا

غیر سے بولے نہ یاروں ہی سے
بات کہے تو اشاروں ہی سے

سمجھے تو کوئی داد کو پہنچے
عاشق کی فریاد کو پہنچے

۱؎ ہو گیا۔ ۲؎ دل میرا ۳؎ چاک بچاک

ورنہ رہے من مار کر اپنا / سر دے مارے ہار کر اپنا

کیونکر غم سے ہو آزادی / جان کے ساتھ اُس کی ناشادی

کوئی نہ اس پر سایہ گستر / اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر

نے کعبے نے دیر کے قابل / مذہب اس کا سہر کے قابل

کیا کہئے اب کیسا کچھ تھا / القصہ وہ ایسا کچھ تھا

صفتِ دلبر

وہ کیسا تھا جس پر عاشق / جی سے تھا یہ عاشقِ صادق

دیدۂ گل ہیں جاگہ اس کی / نکہتِ گل گردِ رہ اس کی

چشم بَرہ سارا چمن اس کا / نقشِ قدم تھا یاسمن اس کا

آگے اس کے کب خوش آیا / یہ رُو گل نے کہاں سے پایا

گل آشفتہ اس کے رُو کا / سنبل اک زنجیری مُو کا

جب وہ چہرہ تابندہ ہو / ماہِ دوہفتہ شرمندہ ہو

زلف اُس چہرے پر تابن ن / کاکلِ صبح سے خوش آئین

دیکھ اُس رُخ کی نور افشانی / شمعِ مجلس پانی پانی

ہو ہر چند یہ بدرِ کامل / اس چہرے کے ہو نہ مقابل

حوصلہ کتنا اس بے تہ کا / منھ دیکھو آئینۂ مہ کا

رکھتی تھی دعوے ہم چشمی پہ / لیکن اس کی چشم نظر کر

بہتوں کی جب جانیں کھل گئیں / نرگس کی بھی آنکھیں کھل گئیں

دورِ چشم ہے اس کا جب سے / فتنہ اک سوتا نہیں تب سے

رخ لب سے جاں بخشِ عالم / بلکہ سراپا جانِ مجسم

عیسے کو گر لب یہ دکھا دے / ہرگز اس کو بات نہ آوے

کوئی مرد انداز حیا پر — چشم اس کی تھی پشت پا پر
کچھ مت پوچھو تنگی دہن کی — مشکل تھی واں جائے سخن کی
کرکے شمیم زلف گذارا — پھیلا وے ہی عنبر سارا
خط آیا ہی گرد اس لب کے — شاید شکر تنگ[1] ہوا ب کے
دونوں لب اس کے لعل بدخشاں — دست حنائی پنجۂ مرجاں
تھا دیکھا یکسرہ[2] پردے میں — برق خرمن مہ پردے میں
جس دم برقع منہ سے اٹھاتا — خورشید اس دم ڈوبا جاتا
پاردلوں کے خدنگ مژہ کا — کاوش کم کم تنگ مژہ کا
بھوں کی کشش سے دوانہ عالم — تیر نگہ کا نشانہ عالم
تیغ و تبر تھی ابرو اس کی — آتش سرکش تھی خو اس کی
ناز کی مے سے مست رہے وہ — اکثر دست بدست رہے وہ
زلفوں کے سب تار پریشاں — سرا و پر دستار پریشاں
سائے سے اس کے سرو بنایا — خاک رہ سے تدرو بنایا
ہووے خراماں جب وہ کافر — کبک کی ہووے جان مسافر
چشم کرشمہ جان تغافل — شایاں اس کے شان تغافل
کیا جانے وہ حال کسو کا — پتھر دل اس آئینہ رو کا
پاتے ہی ابرو کا اشارا — غمزے نے اک خنجر مارا
جب وہ خرام ناز کرے ہی — جی کو جو پر نیاز کرے ہی
رخصت دے گر عشوہ گری کو — ایک ہی جلوہ بس ہی پری کو
ہنسنے میں وہ صفائی دنداں — برق خرمن عالم امکاں
رشک سحر کو صفائے تن پر — خون صراحی اس گردن پر

[1] ہنگی [2] ایک بار

آہ صفائی اس سینے کی ؎ غیرت افزا آئینے کی
شکلِ چیں میں یہ ناز کہاں ہے ؎ صورت ہے انداز کہاں ہے
ایسا خوب جہاں میں کہیں ہے ؎ رحم ہے اس پر اب جو نہیں ہے
جب وہ شکل نظر آتی تھی ؎ کلفت دل کی نکل جاتی تھی
رنگیں اس کی اس کفِ پا سے ؎ جائیں نکو بائی اپنی جا سے
چشم کرو انصاف کی گر وا ؎ یوسف و شیریں لیلیٰ عذرا
کون ہوا اس محبوبی سے ؎ خوبی تو تھی پر اس خوبی سے
بارِ نزاکت کیونکہ اٹھاوے ؎ شاخِ گل سا لہکا جاوے
ہے گی رگِ گل یا رگِ جاں ہے ؎ پر نازک اسرار میاں ہے
صید فلک قربانی اس کا ؎ یوسف اک زندانی اس کا
اور جو خوباں پاویں اس کو ؎ بات دیگر دکھلاویں اس کو
جاوے اس پر جان سبھوں کی ؎ تیغ لیے ہے درمیاں سبھوں کی
تھانبا جائے کس کے کہے وہ ؎ غصے ہو تو پھر نہ منے وہ
کیا کوئی شوخی اس کی بتاوے ؎ کچھ ٹھہرے تو کہنے میں آوے
کیا ہے اس کے آب و گل میں ؎ آرزو اس کی سب کے دل میں
سب کو میل اس بت کی ادا کا ؎ بندہ کون رہا ہے خدا کا
دیکھے نہ عاشقِ زار کو اپنے ؎ پوچھے نہ بیمار کو اپنے
عاشق ظلم و جور و جفا کا ؎ دشمن جانی اہلِ وفا کا
کوچہ رشکِ فزائے کعبہ ؎ واں پہونچے نہ دعائے کعبہ
ہر شب اک فریاد و تظلم ؎ اٹھ گئی واں سے رسم ترحم
آہیں جن کی ورد و وظائف ؎ سو دل خستے واں کے خائف

لے قابلِ رحم ہے وہ شخص جو اس زمانے میں نہ ہوا کہ اسے دیکھتا ۔ ؎ نیک لوگ لغزش سے اپنی جگہ پر قائم نہ رہیں ۔ ؎ ایک دوسرے کو

دلدار کا جانا اور عاشق کی خواری

کر اے خامہ وہ تحریر اب — آوے زباں پر جو تقریر اب
یعنی میرؔ اس خستہ غم کی[۱۷] — سر تا پا اندوہ و الم کی
یار سفر کا مائل ہو کر — حب وطن کو جی سے دھو کر
رخصت کو اس پاس بھی آیا — جلنے کے تئیں اور جلایا
وقت وداع قیامت گزرا — سر سے آب حسرت گزرا
ایک دم بے خود ہو کے رہا وہ — اس سے آگے آپ گیا وہ
آنکھیں لگیں ناسور ہو بہنے — دیکھ کر اس کو لگا یہ کہنے
ظلم ہے لوہو پیتے رہیے — جان گئی پر جیتے رہیے
عمر عزیز چلی یوں جاوے — اور فلک آنکھوں سے دکھاوے
آخر کرکے خدا کا حوالا — آئینے پر پانی ڈالا
تا کے وہ منھ دکھلاوے شتابی — راہ دور سے آوے شتابی

یار گئے پر میرؔ جو اب ہے
جان سے خالی اک قالب ہے

راقم غم ہے وہ دل تفتہ — نامہ بر اس کا رنگ رفتہ
غم سے فرصت اس کو کہاں ہے — قاصد اشک ہمیشہ رواں ہے
خط لکھتا ہے اس مضموں سے — تر ہو بال کبوتر خوں سے
خط سے اک آتش پر ہووے — جس سے کباب کبوتر ہووے
جب درد دل اُن نے لکھا ہے — شعلہ خط میں لپیٹ دیا ہے
سوز کے آوے جب وہ بیاں پر — شعلہ اک جوں شمع زباں پر
جب کرے خون جگر سے انشا — یار کا اپنے شوق کف پا

۱۷ اس خستہ غم کا یار۔

ہو انگشت بریدہ خامہ ۔ اور جدائی کا غذِ نامہ
راہ پہ بیٹھا وہ سرگشتہ ۔ دیکھے راہِ عمرِ گذشتہ
آگے تھا کب ہجراں دیدہ ۔ آہ وتازہ ظلم رسیدہ
کیا کیا بے طاقت ہوتا ہی ۔ ہر دم جی رخصت ہوتا ہی
حال عجب ہی رنجوری سے ۔ مرنے قریب ہی وہ دوری سے
جب وہ دردِ دل کو جاوے ۔ باتوں پر اس کی رونا آوے
دستہ دستہ داغ بسر ہی ۔ پرکالہ دل پرکالہ جگر ہی
اشک نہیں آنکھوں سے ٹپکتا ۔ ہی یہ گرہ اک دل کی تمنّا
داغِ درد ہی گلشن گلشن ۔ گل ہی چنے دامن دامن
چھوڑے نہ راہ و رسمِ وفا کو ۔ دے پیغام ہمیشہ صبا کو
پاس اس کے ہو تیرا گر جانا ۔ بھولوں ہوؤں کو یاد دلانا
زیرِ لب اس کے بات یہی ہی ۔ شام سحر دن رات یہی ہی
کھینچیں گے کب تک یہ سختی ہم ۔ پھر بھی ملیں گے جیتے جی ہم
بس اے خامہ رکھ لے زباں کو ۔ تاب نہیں ہی اہلِ جہاں کو
غصۂ غم کو نہایت کب ہی ۔ اس سے خموشی اب انسب ہی

حکایتِ عشق

(۵)

چمن سے عنایت کے بادم وار — الٰہی زباں دے مجھے معجز دار
صفت عشق کی تا کروں میں بیاں — رہوں عشق کہنے سے میں تر زباں
عجب عشق ہے مردِ کار آمدہ — جہاں دونوں اس کے ہیں برہم زدہ
جہاں جنگ[۵۱] صف کی یہ ظالم لڑا — صف الٹی جہاں ایک مار اپڑا
اگر لوگ مارے گئے سر بسر — ہوئی فتح اُس کی ہے یہ طرفہ تر
کوئی کشتنی جو طرف ہو گیا — تہِ تیغ اُس کے تلف ہو گیا
جہاں جس کسو سے اسے چاہ ہے — وہیں اس کے تا قتل ہمراہ ہے
کسو سے اگر ہو گئی لاگ سی — درونی میں اس کے لگی آگ سی
ہوا ملتفت یہ کسو سے کہیں — تو نام و نشاں اس کا پھر واں نہیں
وفاق اس کا نکلا سراسر نفاق — پڑا عاشقوں میں عجب اتفاق
جواں کیسے کیسے موئے عشق میں — بہت گھر خراب ہوئے عشق میں
بہت عشق میں لوگ روگی ہوئے — بہت خاک مل منھ پہ جوگی ہوئے
گئے دشت میں کچھ نمد مو[۵۲] ہوئے — کچھ اک شہر میں پھر کے یکسو[۵۳] ہوئے
کسو کا جگر غم سے خوں ہو گیا — کسو کوہ کن کو جنوں ہو گیا
کوئی زار باراں بہت رو چکا — کوئی برق سا جل بجھا ہو چکا
غرض عشق کا ہر طرف شور ہے — نئی روز شہروں میں اک گور ہے
بہت جان ناکام دیتے گئے — تمنائے دل ساتھ لیتے گئے
بہت اہلِ اسلام کافر ہوئے — بہت اولِ عشق آخر ہوئے

۵۱ جنگ صف بستہ ۵۲ بالوں کا نمدہ بن گیا ۵۳ کنارے لگے - مر گئے

بہت جرمِ الفت پہ مارے گئے
جُوا عشق بازی کا ہارے گئے

ہوئے خانداں کیسے کیسے خراب
جواں جوں جوانی گئے کیا شتاب

کیا عشق جس دن سے مرتے رہے
جنوں ہی کا اندیشہ کرتے رہے

کسے عشق نے جی سے مارا نہیں
یہی درد ہے دردِ چارہ[1] نہیں

دوا عشق کی سخت نایاب ہے
سرِ عاشقاں سنگ کا باب ہے

جو ہو عشق عارض تو پھر یاس ہے
عبث کوئی دن جینے کا پاس ہے

محبت ہی نیرنگ سازِ عجیب
فسانے ہیں اس کے عجیب و غریب

کوئی عشق کرنا دھرا تھا ورے[2]
گئے میکدے سے بھی صوفی پرے

نہ واں مکر و نے شید[4] و طامات ہے
خرابات جانا کرامات ہے

کہیں عشق نے آرزوکش کیے
گئے خوش جو عاشق سو ناخوش کیے

کہیں سہل تر یار مرنے لگے
کہیں لوگ دشوار مرنے لگے

کہیں کام ان نے کیے ہیں عجب
فسانہ ہوئی بزمِ عیش و طرب

کہیں بادشہ اس سے درویش ہیں
کہیں اس سے درویش دل ریش ہیں

لیا کاہ کا کوہ سے کیں[5] کہیں
ملائے کہیں آسمان و زمیں

کہیں پڑ گئے اس سے فتنے فساد
رہے زیرِ شمشیر حد سے زیاد

یہ عالم کا آشوب ہے دہر سے
مرادِ خطر گہ ہے اس شہر سے

ہوئے عشق میں زہد کیشاں خراب
رہے دل شکستہ پریشاں خراب

اُٹھا عشق کا شورِ عزلت گزیں
گئے دشت گردی کو کر ترکِ دیں

ہوا عشق سے مجلسِ حال۔ دہر
تو اجد لگے کرنے شیخانِ شہر

کیا عشق میں ترکِ صوم و صلوٰت
گئے اہلِ مسجد سوئے سومنات

مسلماں ہوئے عشق میں برہمن
گئے کعبے کو چھوڑ دینِ کہن

[1] درد کا علاج [2] اس کنارے [3] آسان [4] فریب [5] بدلہ۔ انتقام۔

نہ سجہ نہ زنار نہ کفر و دیں
جہاں سب ہی عشق اور کچھ بھی نہیں
محبّت کے ساغرکش اہلِ صلاح
یہ بے ہوش دارو ہی ان کی فلاح
کوئی ہوش میں اپنے رہتا نہیں
ہر اک چپ ہی کچھ کوئی کہتا نہیں
نمازی ہیں خانہ سیہ عشق میں
مصلے ہوئے ان کے تہ عشق میں
ہمہ خاندانِ نقاوت خراب
خرابے سے ہیں بے تفاوت خراب
یہی عشق جس سے کہ حاصل ہی کام
یہی عشق ہی جس سے نکلا ہی نام
اسی عشق سے روسیہ روسفید
رکھیں عشق سے ناامیداں امید
یہی عشق ہی عقدۂ دل ہی یہ
یہی عشق حلّال مشکل ہی یہ
کہیں اس کو لڑنے سے پایا معاف
کہیں ان نے میدان مارے ہیں صاف
کہیں مومنانہ اسے دردِ دیں
کہیں کافرانہ ہوا بے یقیں
غرض عشق ہی طرفہ نیرنگ ساز
کہیں ناز یکسر کہیں ہی نیاز

حکایت

جوان خوش تھا پرکار و پرہیزگار
بہت حُسن کا اس کے واں اشتہار
بہ صورت بہ طاعت بہ دامانِ پاک
نہ دامن پہ مانند گل گرد و خاک
اگر ہووے حورِ بہشتی دوچار
وہ دریائے حسن اس سے ڈھونڈے کنار
و گر آگے سے ہو پری کا گزر
حیا سے نہ اس پر کرے ٹک نظر
رہے محو پاکیزگی و صلوات
نہ ہو ترک سہواً کبھی واجبات
تناسب بہت اس کے اعضا سے خوب
سراپا میں دیکھو تو ہر جا سے خوب
زبان نرم طالع وری و صلاح
نہ طنز و کنایہ نہ رمز و مزاح
خوش اندام و خوش رو و پاکیزہ خو
کسو وقت رہتا نہ تھا بے وضو
جوانی کا ہنگام طاعت کا صرف
لبِ سرخ پر دلبروں کا نہ حرف

[1] پرہیزگاری [2] کنارہ - علیحدگی

حیا کو سیاہی سے پلکوں کی راہ
نکلتی تھی باہر نہ گاہے نگاہ

بہت پاک دامن معیشت ہوئی
نظافت[1] نزاہت میں مدت ہوئی

کہ ناگاہ اس راہ یک زن گئی
جیوں پر خدا جانے کیا بن گئی

جواں کی نظر سرمگیں جا لڑی
وہ شرمائی آنکھ اس کے اوپر پڑی

یہ دل مستقل ناشکیبا ہوا
دل طرفِ ثانی بھی بیجا[2] ہوا

نگاہیں ہوئیں ہم دگر آشنا
محبّت کا دونوں نے پانی بھرا

یہی مدتوں دیکھا دیکھی رہی
دلوں کی کسو سے نہ ہرگز کہی

جیوں میں شب و روز مرتے رہے
ولے پاس ظاہر کا کرتے رہے

رہے دیر تک دونوں ناکامِ عشق
نہ آیا لبوں پر کبھو نامِ عشق

یہ کیا دخل اظہارِ الفت کریں
یہی بستہ لب مشقِ حیرت کریں

گھروں میں نگاہیں تھیں کلفت بھری
در و بام پر پڑتیں حسرت بھری

لبوں پر نہ آیا کبھو حرفِ عشق
اگرچہ ہمہ تن رہے صرفِ عشق

بجایا کیے پردے میں سازِ دل
نہ نکلا کوئی نغمۂ رازِ دل

دوانوں میں تو گرم جوشی رہی
دہانوں پہ مہرِ خموشی رہی

کریں حسرت آگیں نگہ چار اور
لب ان کے بہ ساکت بسروں میں شور

کسو سے بھی حرف و حکایت نہیں
محبّت سے شکر و شکایت نہیں

کہیں دردِ دل سو کبھو زیرِ لب
وگرنہ سکوت ان کو تھا جب تب

شب و روز دونوں تھے صورت مثال
بہم محوِ خوبی و صرفِ خیال

پیئے جائیں آنکھیں بھری بہرِ ضبط
کہ جانا نہ جاوے یہ آپس کا ربط

کبھو آہ اٹھے تو دم سرد ہو
کہیں منکشف تا نہ یہ درد ہو

دلوں میں جو تھی چاہ خوں ہو گئی
گرفتہ رہی سو جنوں ہو گئی

[1] پاکیزگی۔ [2] بے ٹھکانے۔

بیاباں کی جانب کھنچے دل بہت
کہ تھا شہر میں کام مشکل بہت

ارادے ہوئے یہ دلوں میں نگوں
کیا پھر بھی دونوں نے صبر و سکوں

صبا سے رہے دو طرف کے پیام
کہ اے باد کہیو یہ بعد از سلام

خیالات ملنے کے جاتے نہیں
قرار و سکوں دل تک آتے نہیں

شب و روز رہتا ہے یاں اضطراب
کیا شوق نے کام کو کیا خراب

کوئی طور ملنے کا ایجاد کر
نہ جو رحم سے ہو تو بیداد کر

پیام ایک کا یہ کہ اے بادِ نرم
کہا اس کو محبت سے کچھ بھی ہے شرم

تنِ زار بے جان کیونکر جیے
جگر میں نہ ہو خون تو کیا پیے

ملاقات کا رکھیے کیونکر خیال
رہے کیونکہ جاں ناامیدِ وصال

اگر دیکھیں آنکھیں ہیں دو اس طرف
دگر منہ ہمارا ہے سو اس طرف

اسے دیکھنا ہی ہے ارمان بھی
ادھر ہی چلی جائے ہے جان بھی

کہا اس سے کہ مرتے ہیں تیرے لیے
کیا عشق - یا جرم ہم نے کیے

نہیں صبر آتا ترے بن ملے
لبوں سے جگر تک بھریں ہیں گلے

کسو سے کسو کو نہ ہو جائے لاگ
کہے تو لگائی ہے سینے میں آگ

کسو کا کسو سے نہ لگ جائے دل
کہ کہنا پڑے ہائے دل وائے دل

کسو کی نہ اچھی لگے کوئی آن
کہ جانِ المناک دیجے ندان

کسو کے مجعّد[1] نہ کھل جائیں بال
کہ ہو دل کے عقدوں کی واشد محال

کسو لالہ رخ کا نہ اٹھے نقاب
کہ ہوں داغ دونوں مہ و آفتاب

قد آیدا نہ ہو فتنہ در سر کوئی
کہ سر پر قیامت رکھے ہر کوئی

کسو کی نہ چاہِ زنخ میں گریں
مبادا کہ واں سے نہ جیتے پھریں

کسو کے نہ انداز پر جا سے جا
صبا ہوئے کیا جانیے کیا سے کیا

[1] جوڑا باندھے ہوئے۔

کسو کی نہ آنکھوں کو دیکھا کریں
کہ لوگ اس کا آخر پہ دیکھا[51] کریں

کسو کے نہ ایماے ابرو پہ جائیں
فریب فریبندگاں تا نہ کھائیں

صبا چلتے اس سے یہ کہہ آئیو
کہ غافل ہی ہم سے نہ ہو جائیو

دل زار تجھ بن ہے بے کل بہت
نہ جی کو مرے بن ملے پل[52] بہت

گئے ہم سے پھر ہاتھ آتے نہیں
یہ گم گشتہ پھر پائے جاتے نہیں

انھیں کا نہیں رہتا نام و نشاں
کوئی ان کو ڈھونڈھے تو پہ پھر کہاں

کہیں یوں فراموش ہوتے ہیں یار
ہمارا ترا عشق ہے یادگار

ترحم کہ اب بھی گیا کچھ نہیں
تلطف کہ ہم ہیں رہا کچھ نہیں

نہ کر یوں کہ افسوس باقی رہے
گل تر پہ چنداوس باقی رہے

گھٹی جان جاتی ہے یوں ہر زماں
تلف جیسے ہر دم ہو آب رواں

نہ ہو جاتی اے کاش الفت ہمیں
اٹھانی نہ پڑتی یہ کلفت ہمیں

نہ آنکھیں لگی ہوتیں ناگاہ کاش
کہ چھاتی کی دل تک نہ جاتی خراش

نہ دل کو ہوئی ہوتی چسپیدگی
کہ داغوں کو ہوتی نہ بالیدگی

نہ پڑتی مری آنکھ گر اس کی اور
تو اٹھتا نہ سر سے جنوں کا یہ شور

ہوئی آتش عشق آخر بلند
جگر دل ہوئے دونوں اس کے سپند

زبانیں تھی اس آگ کی کیا دراز
ہوئی دونوں بتیا بوں کی جاں گداز

پڑی آگ وہ دل جگر جل گئے
جگر دل نہ بل دونوں گھر جل گئے

ہوا ناگہاں شوہر زن مریض
نہایت ہوئی تپ طویل و عریض

بدن کاہ سا رنگ کاہی ہوا
بہت حال اس کا تباہی ہوا

دموں پر بھی وہ رفتنی کم رہا
ٹھہر کر گئے دم ہوا ہو گیا

جلانے کی تیاری کرنے چلے
چلی زن بھی تا ساتھ اس کے جلے

۵۱ تاڑلیں، چرچا کریں - ۵۲ مثل

لگی بے چلنے چھوڑا نہ اصرار کو
خبر پہونچی اس نو گرفتار کو

کہا ہم کو کیا کہتی ہو اس گھڑی
نظر اُس کی جلتے جو اُس پر پڑی

کہا آئے ہو تو چلے آؤ تم
شتابی کرو جو ہمیں پاؤ تم

یہ بیتاب تھا آگ پر پھر پڑا
پتنگا سا اس آگ پر گر پڑا

لگے آتے تھے کتنے انفار ساتھ
وہیں کھینچ لائے اسے ہاتھوں ہاتھ

قدم کتنے چل کر وہ آتش بجاں
ہوا یوں سخن زن کہ اے دوستاں

نہیں متصل راہ چلنے کی تاب
کہ ہوں نیم سوز آگ کا میں کباب

توقف کیا سب نے زیرِ درخت
کہا واقعی رنج کھینچا ہے سخت

نہ جانا کہ ہے مانعِ راہِ عشق
رکھے ہے عجب جذب جانکاہِ عشق

نہ آتش نہ گرمی نہ بے طاقتی
بہانے ہیں سب جذب ہے الفتی

عجب تر نظر آتے ہیں کارِ عشق
نہیں سمجھے جاتے ہیں اسرارِ عشق

اگر آنکھیں کھلتیں تو اُودھر نظر
ہوئی خاک معشوقہ جل کر جدھر

گیا منتظر اس کو وہ دن تمام
نظر کر کے کیا دیکھتا ہے کہ شام

خراماں جہاں آتی ہے وہ پری
وہی ناز و عشوہ وہی دلبری

وہی صورت اس کی ہے جلوہ نما
وہی رنگِ بوئے گل سا غیرت فزا

اُسی طرز و انداز و خوبی کے ساتھ
اُٹھایا اسے ہاتھ میں لیکے ہاتھ

گئے اس طرف سے جدھر تھی چلی
نظر کرتے تھے واقعی یہ سبھی

ہوئی جاتے جاتے نظر سے نہاں
گیا عشق کیا جانیے لیکر کہاں

نہ کر میر اب عشق کی گفتگو
قلم اور کاغذ کو رکھدے بھی تو

فسانے ہیں اس کے ہزاروں ہزار
بہت خاک جل جل کے یاں ہو گئے

یہی کشت و خوں کا ہے یہ گرم کار
رہِ عشق میں جی بہت کھو گئے

غرض ایک ہے عشق بے خوف و باک
کیے دونوں معشوق و عاشق ہلاک

معاملاتِ عشق

(۶)

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہی عشق
حق اگر سمجھو تو خدا ہی عشق

عِشق ہی عشق ہی نہیں ہی کچھ
عِشق بن تم کہو کہیں ہی کچھ

عِشق تھا جو رسول ہو آیا
ان نے پیغام عِشق پہونچایا

عِشق حق ہی کہیں نبیؐ ہی کہیں
ہی محمدؐ کہیں علیؓ ہی کہیں

عِشق عالی جناب رکھتا ہی
جبرئیل و کتاب رکھتا ہی

عِشق حاضر ہی عِشق غائب ہی
عِشق ہی مظہرِ عجائب ہی

عِشق کیا کیا مصیبتیں لایا
روز کو رات کرکے دکھلایا

عِشق میں لوگ زہر کھاتے ہیں
عِشق سے رنگ سبز لاتے ہیں

عِشق سر تا قدم اُمید رہوا
زیرِ تیغِ ستم شہید ہوا

مجھ سے یہ پوچھ مت کہیں ہی عِشق
عِشق ہی اُن ہی کو جنھیں ہی عِشق

عِشق سے رنگ زرد ہوتا ہی
عِشق سے دل میں درد ہوتا ہی

رہتے ہیں عشق ہی میں مژگاں تر
یہیں دیکھی ہیں آنکھیں آتے بھر

عِشق ہی کا خراب ہی کنعاں
عِشق ہی ایک خانہ آبادال

عِشق لایا ہی آفتیں کیا کیا
اس سے آئیں قیامتیں کیا کیا

قیس کیا رنج کھینچ کھینچ موا
سر پہ فرہاد کے سُنا جو ہوا

عِشق نے چھاتیاں جلائی ہیں
آگیں کس کس جگہ لگائی ہیں

عِشق میں ایک جی کو کھو بیٹھے
ایک آنکھوں کو روکے رو بیٹھے

ایکوں کا جیب تا بدامن چاک
ایک ڈالے ہے سر کے اوپر خاک

شان ارفع ہے جن کی خوار ہیں یاں
عقل والے جنوں شعار ہیں یاں

خستۂ عشق کچھ نہ میر ہوئے
بادشاہ عشق میں فقیر ہوئے

کوئی دل تنگ ہو کوئیں میں گرا
کوئی ڈوبا کوئی گیا نہ پھرا

جب پتنگا ہوا تھا اس سے داغ
تب دیا جی کو ان نے پیش چراغ

عشق کی فاختہ ستمکش ہے
عشق سے عندلیب دم کش ہے

عشق باعث ہوا وطن چھوٹے
مرغ پکڑے گئے چمن چھوٹے

مایۂ درد و رنج سب ہے عشق
متصل رونے کا سبب ہے عشق

پڑ گئے دل جگر میں آخر چھید
کچھ نہ پایا کنھوں نے عشق کا بھید

تیز تیغِ ستم جو اینچے عشق
جامے بہتوں کے خوں میں کھینچے عشق

عشق سے قمری ہے حریفِ سرو
مہ سے آنکھیں لڑا رہا ہے تدرو

عشق کے دل فگار سارے ہیں
ان نے کیا کیا جوان مارے ہیں

کہیں حق ناحق ان نے خون کیئے
کہیں سر پر کھڑا ہے تیغ لیئے

کوئی محوِ گزاف ہیں اس سے
کہیں میدان صاف ہیں اس سے

اس سے یک جمع نے لیا ہے جوگ
ایک فرقے کا ہے یہ جی کا روگ

ایک کے لب پہ آہ ہے اس سے
ایک کا دن سیاہ ہے اس سے

ایک کا شیوہ اس سے نالہ کشی
ایک کو بیدمی ہے جیسے غشی

ایک ناشاد زندگانی سے
ایکوں کے دل گداز پانی سے

ایک کے پھول گل پہ نالے ہیں
ایک کی جان ہی کے لالے ہیں

ایک نے کوہ اس سے توڑ دیئے
ایک تنکا کر ان نے چھوڑ دیئے

چُپ لگی ہی کسو کو اس کے سبب
بند رہتے نہیں کسو کے لب

کوئی باتیں کرے ہی شوق کے ساتھ
کوئی چُپکا ہوا ہی ذوق کے ساتھ

ہی تواجد کسو کو حال کہیں
کہیں نقصان ہی کمال کہیں

ایک محوِ لباسِ عریانی
ایک سر گرمِ دامن افشانی

کسو کو فکر کوئی ذاکر ہی
کوئی صابر ہی کوئی شاکر ہی

کہیں وسعت کہیں ہی تنگ اوقات
عشق کے ہیں گے مختلف اوقات

سیر قابل ہیں اس کے دیوانے
سُننے کے گو ہیں اس کے افسانے

وصل میں جن کے دل رہیں بیجا[١]
فصل ہو تو اُنھوں کا حال ہو کیا

اس بلا سے مجھے بھی کام ہوا
عاشقِ زار میرا نام ہوا

قصہ میرا بھی سانحہ ہی عجب
کس پہ گزرا ہی یہ ستم یہ غضب

(١)

ایک صاحب سے جی لگا میرا
ان کے عشووں نے دل ٹھگا میرا

ابتدا میں تو یہ رہی صحبت
نام سے ان کے تھی مجھے اُلفت

خوبی ان کی جو سب کہا کرتے
گوش میرے ادھر رہا کرتے

بخت برگشتہ پھر جو یار ہوئے
اک طرح مجھ سے وے دو چار ہوئے

کیا کہوں طرز دیکھنے کی آہ
دل جگر سے گزر گئی وہ نگاہ

چُھپکے منھ ان کا دیکھ رہتا ہوں
جی میں کیا کیا ہی کچھ نہ کہتا ہوں

پیار چتون سے پھر نکلنے لگا
دیکھنا دل کو میرے ملنے لگا

کچھ کچھ آزار مجھ کو دینے لگے
قسم اقسام مجھ سے لینے لگے

ایک ٣ دو دن میں بعد رفعِ ملال
لطف سے پوچھتے ٢ کہو کچھ حال

جو گزرتی تھی مجھ پہ میں کہتا
ہاں کوئی اشک آنکھ سے بہتا

١ بے ٹھکانے

کیا کہوں کیا قدِ بالا ہی
قالبِ آرزو میں ڈھالا ہی

ایک جاگہ سے ایک جاگہ خوب
پیکرِ نازک اس کے سب محبوب

موے سر ایسے جی بھی کریئے نیاز
بل ہی کھایا کرے یہ عمر دراز

اس کی کاکل سے حرف سر نہ کرو
کاکلِ صبح پر نظر نہ کرو

کچھ بھی نسبت ہی تم کو سودا ہی
کالے کوسوں کی بات کا کیا ہی

اُس کی زلفوں میں دل گئے نہ پھرے
رہے سنبل کے پیچ پاچ دھرے

اُس جبیں سی ہی دل کی کیا جاذب
صبح صادق کی دعوی ہی کاذب

ویسی بھوئیں کشیدہ بھی ہیں کہیں
یہ کمانیں کسو سے کھنچتی نہیں

پھری پلکوں کی اور سب کی نگاہ
چشم پر میری تیری چشم سیاہ

کہوں چتون کے دیکھنے کا طور
اس قیامت پہ وہ قیامت اور

سطحِ رخسار آئینے سے صاف
جو نہ ٹھہرے نگہ تو رکھیے معاف

لطف بینی کا فہم ہی دشوار
ایک باریک بینی ہی درکار

کیا جھمکتا ہی ہائے رنگِ قبول
جیسے نکھڑا گلاب کا سا پھول

ہی دہن تنگی سے سخن کوتاہ
کچھ نکلتی نہیں سخن کی راہ

اس سے گل کیا چُنے کوئی ہمدم
غنچہ ناشگفتہ سے بھی کم

برگِ گل سے زباں ہی نازک تر
پھول جھڑتے ہیں بات بات اوپر

کیا کہوں کم ہیں ایسے شیریں گو
وہ زباں کاش میرے منھ میں ہو

ان لبوں کا مزا لیا سنو بھانت
تس کے اوپر ہمارا ابھی ہی دانت

کوئی جان بخش یوں کہے سو کہے
ہم تو مرتے ہی ان لبوں پہ رہے

کنج لب آرزوئے جان و دل
آگے چلتا نگاہ کو مشکل

ان لبوں سے جو کوئی کام رکھے
قند و مصری کو کیوں نہ نام رکھے

۱؎ نادر کردیجیے۔

جو حلاوت اُنھوں کی کہیے اب — ہم دگر سے جدا نہ ہوویں لب
جب وہ کھاتے ہیں بیڑۂ پان کو — رو نہیں دیتے لعل و مرجان کو
ایسی ہوتی نہیں ہے سرخ بھی — رنگ گویا ٹپک پڑے گا ابھی
ہے تبسّم سے لعل کا دل خوں — ہنستے دیکھا تھا سو مجھے ہے جنوں
نہیں دیکھے مسی ملے دنداں — برقِ ابرِ سیہ ہے تب خنداں
کیسے کیسے چمکتی ہے بے تہ؎ — جاگ ہنسائی کرے ہے اپنی یہ
بو اگر کیجیے اس زنخ کا سیب — جائے سر سے جنوں کا آسیب
کیا نظرگاہ کی کروں خوبی — نظریں اُٹھتی نہیں یہ محبوبی
شانہ و دست ساعد و بازو — دل کشی میں تمام یک پہلو
یوں نہیں سرخ اس کی ہر انگشت — ڈوبی ہیں میرے خون میں یکمشت
وہ کفِ دست راحتِ جاں ہے — کاش سینے پہ رکھدے غم یاں ہے
کیا بیاں خوبیِ شکم کو کرے — دیکھنے سے کبھو نہ پیٹ بھرے
صدر کے ناچے سے لے تا ناف — چُپ کی جاگہ ہے کیونکہ کہیے صاف
گئی نظروں سے وہ کمر باریک — ہو نہ آنکھوں میں کیوں جہاں تاریک
نازکی اس میاں کی کیا کہیے — بنے تو ہاتھوں میں لیے رہیے
ٹک اگر لچکے تو قیامت ہے — پھر قیامت تلک ندامت ہے
کیوں پڑی ران پر نظر تا ساق — اُس بن اب زندگی ہوئی ہے شاق
پائے جاناں سے گفتگو ہے اب — خاک میں ملنے کا یہی ہے ڈھب
وہ کفِ پا قریب ہو میرے — ٹھوکر اُس کی نصیب ہو میرے
پنڈلی نازک ہے شاخِ سنبل کی — پشتِ پا پنکھڑی سی ہے گل کی
ناخنِ پا حنائی ہیں ایسے — برگِ گل پائے سرو ہوں جیسے

؎ کونہ ۔ کنارہ

ہو خراماں تو اس طرف نگہیں[1]
گل کفش اس کی لوگ دیکھ رہیں

گل و بلبل سبھی تماشائی
آ گئے جس طرف بہار آئی

رنگِ رفتار دیکھ مجنوں ہو
طرزِ گفتار جیسے افسوں ہو

سر سے پاؤں تلک وہ محبوبی
ساتھ ان خوبیوں کے یہ خوبی

کہ بہت دل ہے آشنائے رحم
دردمندوں کو جانے جائے رحم

نہیں آزار کی روا داری
مہر ورزی ہے یا وفاداری

پر جو معشوقی آب و گل میں ہے
چھیڑ رکھنے کا شوق دل میں ہے

(۳)

جانتے تھے کہ ہے یہ دل دادہ
سید خستہ خاک افتادہ

دیکھتے مجھ کو جو پریشاں دل
کہتے اے میر کچھ نہیں حاصل

دیکھ ٹک تو ہی تیرا حال ہے کیا
جانے دے اب بھی یہ خیال ہے کیا

آفتِ جاں ہے دوستی کرنا
کب تلک گھٹ کے اس طرح مرنا

(۴)

گل رووں بن جگر ہے داغِ کباب
گیسوؤں بن ہے جی کو پیچ و تاب

صورت ان کی خیال میں ہر دم
خواب میں جو ہو وہ مژہ باہم

میں تو بستر پہ دل شکستہ اداس
چاند سا منھ انھوں کا تکیے پاس

میں بچھونے پہ بے خود و بے خواب
ایک پیکر پری کا سا ہم خواب

میں تو افتادہ محوِ عجز و نیاز
بازوؤں پر کسو کی بالش ناز

جلتی آنکھوں سے گل رخسار
جس پہ کچھ بکھرے موئے عنبر بار

پاس منھ کے دے لال تر[2] نازک
دستِ گستاخ پر کمر نازک

فرش اس گلبدن سے سب بو یا[3]
پھول میں نے بچھائے تھے گویا

[1] یعنی نگاہیں [2] ہونٹھ [3] خوشبودار

شب کٹے صورتِ خیالی سے
دن کو ہوں میں شکستہ حالی سے

گرچہ روزانہ یہ تصور تھا
لیکن اندوہ سے مکدّر تھا

کہیں تصویر سی نظر آئی
کہیں منھ پھیر جیسے شرمائی

صورتِ حال اور کچھ ہر دم
گاہ لب خشک گاہ مژگاں نم

آشنا یار سارے بیگانے
کہ ہوئے میر جی تو دیوانے

رشتۂ ربط انھوں نے توڑ دیا
ملنا جلنا سبھوں سے چھوڑ دیا

نظر آتے نہیں ہیں مدت سے
انس پیدا کیا ہے وحشت سے

صبح ہوتے ہی گھر سے چلتے ہیں
جیسے کھوئے گئے نکلتے ہیں

چلے جاتے ہیں دیکھتے ہی راہ
پر کہیں کی کہیں پڑے ہے نگاہ

مل گیا جو کوئی تو بچ نکلے
سڑی خبطی دیوانے بیچ نکلے

شوق سے ان کے حال دیگرگوں
پارہ پارہ دل و جگر سب خوں

رنگ ہر دم مزاج کا کچھ اور
کل کا کچھ اور آج کا کچھ اور

کیا بیاں کریے بے قراری کا
ذکر کیا حالِ اضطراری کا

جی پڑا ترسے ساتھ سونے کو
دل پریشان جمع ہونے کو

۵

بارے کچھ بڑھ گیا ہمارا ربط
ہو سکا پھر نہ دو طرف سے ضبط

تب ہوا بیچ سے یہ رفع حجاب
جب بدن میں رہی نہ مطلق تاب

ایک دن ہم وے متصل بیٹھے
اپنے دل خواہ دونوں مل بیٹھے

ہو گئے بخت اپنے برگشتہ
پھر گیا آسماں سے سرگشتہ

بات ایسی ہی اتفاق پڑی
کہ ہوئی سر پہ فرقت آن کھڑی

دل ٹھہرتا نہ تھا ملالت تھی
جان کو رفتگی کی حالت تھی

اب جو گھر میں ہوں تو فسردہ سا
چار پائی پہ ہوں تو مُردہ سا

جی اُنھوں میں فسردہ قالب یاں
متحرک ہو کیا تنِ بے جاں

حال دل کا کہوں جو ہمدم ہو
کروں پیغام کچھ جو محرم ہو

جی میں کچھ آیا رو کے بیٹھ رہا
دل زدہ چپکا ہو کے بیٹھ رہا

دیکھیے چند یوں رہیں گے جدا
چاہیے ہو کیا ہمارے حق میں خدا

خونِ دل کب تلک پئیں گے ہم
رنگ یہ ہے تو کیا جئیں گے ہم

یاد کر روؤں ان کی کونسی بات
کس طرح کاٹوں ہجر کے اوقات

ملنا ان سے بھی ہو گھٹے غم بھی
آئے جیتوں میں جانیئے ہم بھی

مدّتِ ہجر اگر تمام ہوئی
ورنہ اپنی تو صبح شام ہوئی

۱؎ لب تلک

خواب و خیال

(۳)

خوشا حال اس کا جو معدوم ہے
کہ احوال اپنا تو معلوم ہے

رہیں جانِ غم ناک کو کاہشیں
گئیں دل سے نومید سو خواہشیں

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دل

گئی کب پریشانیِ روزگار
رہا میں تو ہم طالعِ زلفِ یار

وطن میں نہ اک صبح میں شام کی
نہ پہونچی خبر مجھ کو آرام کی

اُٹھاتے ہی سر یہ پڑا اتفاق
کہ دشمن ہوئے سارے اہلِ وفاق

جلاتے تھے مجھ پر جو اپنا دماغ
دکھانے لگے داغ بالائے داغ

زمانے نے آوارہ چاہا مجھے
مری بیکسی نے نباہا مجھے

رفیقوں سے دیکھی بہت کوتہی
غریبی نے ایک عمر کی ہمسری

مجھے یہ زمانہ نہ جدھر لے گیا
غریبانہ چندے بسر لے گیا

بندھا اس طرح آہ بارِ سفر
کہ نہ زادِ رہ کچھ نہ یارِ سفر

دل اک بار سو بے قرارِ بتاں
غبارِ سرِ رہ گزارِ بتاں

گرفتارِ رنج و مصیبت رہا
غریبِ دیارِ محبت رہا

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی
در و بام پر چشمِ حسرت پڑی

کہ ترکِ وطن پہلے کیونکر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

دلِ مضطرب اشکِ حسرت ہوا
جگر خستگانے میں رخصت ہوا

کھچا ساری رہ دامنِ چاکِ دل
رہا بہ قفا روئے غم ناکِ دل

بس از قطعِ رہ لائے دلی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزارِ سخت

جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا — مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام — لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
کبھو کف بلب مست رہنے لگا — کبھو سنگ در دست رہنے لگا
کبھو غرقِ بحرِ تحیر رہوں — کبھو سر بجیبِ تفکر رہوں
یہ وہمِ غلط کاریاں تک کھنچا — کہ کارِ جنوں آسماں تک کھنچا
نظر رات کو چاند پر گر پڑی — تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑی
مہِ چاردہ کارِ آتش کرے — ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے
تو ہم کا بیٹھا جو نقشِ درست — لگی ہونے وسواس سے جان سست
نظر آئی اک شکل مہتاب میں — کمی آئی جس سے خور و خواب میں
اگرچند پرتو سے مہ کے ڈروں — ولیکن نظر اُس طرف ہی کروں
ڈروں دیکھ مائل اُسے اس طرف — بحدے کہ آ جائیں ہونٹوں پہ کف
پڑی فکرِ جاں میرے احباب کو — اڑا دیویں سب گھر کے اسباب کو
کوئی پاس کوئی تفاوت سے ہو — سراسیمہ کوئی محبت سے ہو
کوئی فرطِ اندوہ سے گریہ ناک — گریباں کسو کا مرے غم سے چاک
جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے — نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے
کہے چشم بندی کو ہر یار و غیر — و لے منزلِ دل میں اس مہ کی سیر
وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا — تصور مری جان کے ساتھ تھا
اگر ہوش میں ہوں دگر بے خبر — وہ صورت ہے میرے پیشِ نظر
اسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ — وہی ایک صورت ہزاروں جگہ
نگہ گردشِ چشم سے فتنہ ساز — مژہ آفتِ روزگارِ دراز
عجب رنگ پر سطحِ رخسار کا — مگر تھا وہ آئینہ گلزار کا

جو آنکھ اُس کی بینی سے جا کر لڑے
دمِ تیغ پر راہ چلنی پڑے

مکاں کُنجِ لب خواہشِ جان کا
تبسّم سبب کاہشِ جان کا

دہن دیکھ کر کچھ نہ کہیے کہ آہ
سخن کی نکلتی تھی مشکل سے راہ

سزا ہے جگر اس کسو کے لیے
جو سیبِ ذقن اس کا بو کر جیے

گلِ تازہ شرمندہ اس رو سے ہو
خجل مشکِ ناب اس کے گیسو سے ہو

سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

کہیں مہ کا آئینہ در دست ہے
کہیں بادۂ حسن سے مست ہے

کہیں نقشِ دیوار دیکھا اسے
کہیں گرمِ رفتار دیکھا اسے

کہیں دل بری اس کو درپیش ہے
کہیں مائلِ خوبیِ خویش ہے

کہیں جملہ تن مہر صرفِ سلوک
کہیں مجھ سے سرگرمِ حرفِ سلوک

لطافت سے یک جان ہووے تمیز
سبک سیر مانندِ عمرِ عزیز

کہیں جلوہ پرداز وہ عشوہ ساز
کہیں ایستادہ بصد رنگِ ناز

ہر اک جا سے لے ناز سے وہ سبق
در و بام تصویر کا سا ورق

رہے سامنے اک طرح پر کبھو
رکھے وضع سے پاؤں باہر کبھو

بغل میں کبھو آرمیدہ رہے
کبھو اپنے بر خویش چیدہ رہے

کبھو صورتِ دل کش اپنی دکھائے
کبھو اپنے بالوں میں منھ کو چھپائے

کبھو گرمِ کینہ کبھو مہرباں
کبھو دوست نکلے کبھو خصمِ جاں

کبھو یک بیک یار ہو جائے وہ
کبھو دست بردار ہو جائے وہ

گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو
طرح دشمنی کی نکالے کبھو

کبھو چیں بہ ابرو کبھو ہنستے بات
کبھو بے وفائی کبھو التفات

جو میں ہاتھ ڈالوں تو واں کچھ نہیں
بجز شکل وہمی عیاں کچھ نہیں

۵۱ سونگھ کر

ہر اک رات چندے یہ صورت رہی	اسی شکل وہمی سے صحبت رہی
دم صبح ہو گم وہ جیسے ماہ	کہ درپیش آوے ہے روز سیاہ
کروں جو ہوا کروں بید مجنوں کی طرز	رہے یاد اس سرو موزوں کی طرز
رہوں یوں ہی دو دن میں گاہ بیجا رسا	پریشاں سخن گہ پریشاں رہا
پری خواں[1] کو لا کوئی افسوں پڑھائے	کسو سے کوئی جاکے تعویذ لائے
طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے	نہ پینا جو کچھ تھا پلایا مجھے
دوا جو لکھی سو خلاف مزاج	کیا اس خرابی سے کیا بے علاج
کہ سر رشتۂ تدبیر کا گم ہوا	دل اوپر تجسم توہم ہوا
دروں خود بخود بے حواسی رہی	پریشاں دلی اور اداسی رہی
کروں بے کلی جاؤں تا ہر کہیں	نہ گھر میں لگے جی نہ باہر کہیں
قیامت جنوں کا رہے سر میں شور	کھنچا جائے دل کو وحشی کی اور
رہے شوق سر در گریبان دل	ہوا کھینچے صحرا[2] کو دامان دل
سر آشفتہ زلف گرہ گیر کا	قدم حلقہ در گوش زنجیر کا
جنوں آہ درپے ہوا جان کے	مجوز ہوئے یار زندان کے
کیا بند اک کوٹھری میں مجھے	کہ آتش جنوں کی مگر واں بجھے
لب نان اک بار دینے لگے	دم آب[3] دشوار دینے لگے
کہاں ظلم کا کسب فرصت نہ آہ	ہوا کا بھی واں گشت روزن کی راہ
نہ آوے کوئی ڈر سے میرے کنے	کہ کیا جانئے کیسی صحبت بنے
وہ آشفتہ سر ہوشمندی سے دور	نہیں رابطہ مقتضائے شعور
وہ حجرہ جو تھا گور سے تنگ تر	در اس کا نہ کھلتا تھا دو دو پہر
جواں ہیں کبھو میں سنبھل بیٹھتا	تو باہر بھی اک دم نکل بیٹھتا

۱؎ جس پر پری کا سایہ ہو۔ ۲؎ جنگل کی طرف۔ ۳؎ مشکل سے ایک گھونٹ پانی

پھر اک شام بیٹھا تھا میں ایک روز — نہ طاقت نہ آئی تھی مجھ کو ہنوز

کہ یاروں نے چھیڑا تدبیر کی — مرے خون میں کچھ نہ تقصیر کی

اگر چند کہنے کو خوں کم کیا — لیا لوہو اتنا کہ بے دم کیا

بڑی دیر تک خون جاری رہا — میں بے ہوش وہ رات ساری رہا

جگایا سحر مجھ کو اک شور سے — کھلی آنکھ میری پڑے زور سے

وہی دست تھا وہی نیشتر — وہی رنگ صحبت کا پیش نظر

وہی لوہو لینے کا ہنگامہ پھر — وہی تربتر لوہو میں جامہ پھر

لگے نشتر ایسے کہ لگتے نہیں — چبھی جیسے مژگاں کسو کے تئیں

ہوا خون سے دامن و جیب تر — رگ جاں تلک زخم پہونچا مگر

ٹپکتا رہا دیر تک خون ناب — مجھے لے گئی بے خودی کی شراب

سخن ضعف سے سخت دشوار تھا — پلک کا اٹھانا بھی اک بار تھا

کئی روز بالیں پہ جو سر رہا — خمار ایک مدت تلک پھر رہا

کھڑا ہوں اگر پاؤں لرزاں رہے — بدن بید کی طرح لرزاں رہے

چلا جائے سر پاؤں تھر تھر کرے — نسیم سحر کام صرصر کرے

جفا ضعف سے مجھ کو کیا کیا نہ تھی — افاقت گئی یوں کہ گویا نہ تھی

پس از چند آنکھیں ٹھہرنے لگیں — نگاہیں بھی کچھ کام کرنے لگیں

بندھا ناتوانی کا رخت سفر — کیا طاقت رفتہ نے منھ ادھر

گئے تھا مری زندگانی کا دھیان — ولیکن نہایت تھا میں سخت جان

لگی جان سی آنے اعضا کے بیچ — کوئی روز رہنا تھا دنیا کے بیچ

پھرا ناتواں میں بہت دور سے — کہ نزدیک تھا عالم گور سے

غلط کاری وہم کچھ کم ہوئی — وہ صحبت جو رہتی تھی برہم ہوئی

وہ صورت کا وہم ایسی دیوانگی — لگی کرنے در پر وہ بے گانگی

پس از دیر آنکھوں میں آنے لگی — نہ دو دو پہر منھ لگانے لگی

نہ دیکھے مری اور اس پیار سے — غریبانہ سر مارے دیوار سے

کہیں ٹک تسلی کہیں بے قرار — کہیں شوق سے میرے بے اختیار

کہیں واسطے میرے روتی ہے خون — کہیں دست زیر زنخ ہے ستون

کہیں دل کو اپنے دکھاوے مجھے — مری بے وفائی جتاوے مجھے

کہیں دست بر دل وہ رشک قمر — کہیں حسرت آلودہ مجھ پر نظر

کہیں بے دماغانہ سرگرم ناز — کہیں آتش شوق سے جانگداز

کہیں چشم گریاں سے داماں پاک — کہیں تا جگر سے گریبان چاک

کہیں کام دل کی شکایت سے ہے — کہیں نقش دیوار حیرت سے ہے

کہیں مجھ سے کہتی ہے رخصت مجھے — کہ مطلق نہیں غم کی طاقت مجھے

کہیں لب پہ وہ شکوۂ خونچکاں — کہ ٹپکا کرے جس سے آزار جاں

کہیں وہ نگہ جس سے یہ پایئے — کہ یہ درد دل ہے تو مر جائیے

کہیں وہ روش جس سے نکلے عتاب — کہیں وہ طرح جس سے ہیئے خراب

کہیں حرف زن اس طرح ناز سے — کہ دیکھا گیا دل کس انداز سے

کہیں وہ ادا جس سے معلوم ہو — کہ جیسے وہ عاشق کہ محروم ہو

کہیں وہ سخن جو جگر خوں کرے — کہیں طرز ایسی کہ مفتوں کرے

کہیں وضع ایسی کہ بیگانہ ہے — کہیں آشنا ہے تو دیوانہ ہے

کسو جا ہے جلوے میں اس آن سے — کہے تو کہ بیزار ہے جان سے

کسو وقت اس کا یہ اسلوب ہے — کہ شرم محبت سے محجوب ہے

کبھو بے قراری ہے اس رنگ سے — کہ پھرتی ہے سر مارنے سنگ سے

کبھو بے ادائی و دشنام ہے
کبھو یاد کے ہاتھ پیغام ہے

کہ اے بے وفا آہ دل نرم کر
محبت کی بھی منھ سے کچھ شرم کر

کبھو وہ تبختر کہ پروا نہیں
کبھو کیونکہ کہیے کہ سودا نہیں

کبھو یہ سخن جس سے ہو مستفاد
کہ اے بے وفا حرفِ من یاد باد

کہ ظاہر ہیں میر اب تو آنا گیا
کہ وہ دوستی کا زمانا گیا

غرض نا اُمیدانہ کر اک نگاہ
وہ نقش توہم گیا سوئے ماہ

نہ آیا کبھو پھر نظر اُس طرح
نہ دیکھا اُسے جلوہ گر اُس طرح

مگر گاہ سایہ سا مہتاب میں
کبھو وہم سا عالمِ خواب میں

دلِ خو پذیرِ وصالِ دوام
رہے خواب میں روز و شب صبح و شام

اگر وصل خوابِ فراموش تھا
ولیکن وہی خواب کا جوش تھا

پلک سے پلک آشنا ہے وہی
ز خود رفتگی کی ادا ہے وہی

کھڑا ہوں تو سوتا ہوں اک ذوق میں
رگِ خوابِ دل ہے کفِ شوق میں

جو بیٹھا ہوں خوابِ گراں ہے مجھے
وہ غفلت جہاں در جہاں ہے مجھے

خیال اُس کا آوے کہ مُن ہو رہوں
تلے سر کے پتھر رکھوں سو رہوں

مجھے آپ کو یوں نہیں کھوتے گئی
جوانی تمام اپنی سوتے گئی

دکھایا نہ اُس مہ نے رو خواب میں
نہ دیکھا پھر اُس کو کبھو خواب میں

بہت جستجو وے بے خبر ہو چکا
ہم آغوشِ طالع بہت سو چکا

نہ دیکھا کبھو میر پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

ساقی نامہ

(۵)

ہے قابلِ حمد وہ سر انداز / جو سب میں ہوا ہے جلوہ پرداز
اس کو مے حسن نے چھکایا / ہستی کا نشہ اسی سے پایا
پی اُن نے شرابِ خودپرستی / طاری ہوئی اس پہ زورِ مستی
وہ مستِ شرابِ ناز ہے فرد / خورشید ہے اس کا جام پرورد
ہے گردشِ چشم اس سے افسوں / پھر جائے ہے جس کے ساتھ گردوں
ظلمت ہے دوئی کی جس سے احول / آخر ہے وہی وہی ہے اوّل
عالم ہے قرابۂ مے خام / ہے دورِ سپہر گردشِ جام
مشہورِ جہاں جو کیف کم ہے / بے نشہ جو ہووے تو ستم ہے
وہ مست نیاز ہے حرم میں / وہ رفتۂ ناز ہے صنم میں
ہے آبِ رخ زمانہ اس سے / روشن ہے تمام خانہ اس سے
مینا میں جو سرکشی ہے وہ ہے / صہبا میں جو دل خوشی ہے وہ ہے
شمشاد ہے سرفراز اس سے / گل دیدۂ نیم باز اس سے
خوگر اسے ناز پیشگی[1] ہے / وہ ہے کہ جسے ہمیشگی ہے
جو عکس پڑا ہے جامِ مے میں / آتی ہے صدا اسی کی نے میں
ہے جلوہ گری میں یار صد ناز / وہ مست گزارۂ سر انداز
سو رنگ ہیں اس کی یاد رکھ تو / ہر جلوے سے دل کو شاد رکھ تو
عالم میں جو کچھ نمود میں ہے / ہر لحظہ اسی نمود میں ہے
کر یاد اسی کو اور مے پی / جیتا رہے کوئی دن تو خوش جی

[1] نازپیشگی پروردنا

اب روئے سخن چمن کو کریے / مینائے دل اور سے بھریے
آئی ہے بہار مے گساراں / پھولے ہیں چمن میں گل ہزاراں
آئی ہے بہار وہر خیاباں / بے لطف ہوائے گل بداماں
آئی ہے بہار دیدہ کیشاں / ہے توبہ بادہ دل پریشاں
آئی ہے بہار مرغِ گلزار / کرتا ہے نوائے سینہ افگار
لایا ہے بزور اس کا نالہ / مجھ کو بھی برائے سیر لالہ
ساقی جو کروں ہیں بے ادائی / معذور رکھ اب بہار آئی
گل بادِ صبا کے تا کمر ہے / دامانِ بلند ابرِ تر ہے
غنچے کسی گلابیاں بھری ہیں / تکلیف کی منتظر دھری ہیں
ظالم مے ناب دے ہوا ہے / ایک جرعہ شراب دے ہوا ہے
ہر سر میں ہے شور فصل دے کا / چکے ہے ہوا سے رنگ مے کا
اطرافِ چمن کھلا ہے لالہ / ہر پھول شراب کا ہے پیالہ
آتا ہے چمن پہ ابر جوشاں / آب رخ کار سبز پوشاں
تحریکِ نسیم دم بدم ہے / تکلیفِ ہوائے گل ستم ہے
ابروں نے بھی کی ہے مے پرستی / اٹھتے ہیں بصد سیاہ مستی
بوندوں کا جو لگ رہا ہے جھمکا / رنگ گل و لالہ دور چمکا
ہے گل کی ہوا سبو کشی میں / بلبل کا دماغ بو کشی میں
ہر شاخ ہے شور جام در دست / نرگس ہے کسو کی نرگسِ مست
ہے رنگ ہوا کا آفتابی / پھرتے ہیں نہال جوں شرابی
ہے سرو جوان نشہ در سر / اینٹھے ہے روش پہ ہو کے تر
چشمک کرے ہے جا بجا [illegible] / یعنی کہ ہے دور اب سبو کا

ساقی قدحے کہ ذوقِ گل ہے
مطرب غزلے کہ فصلِ گل ہے

ہو صرفِ شراب کاش ساقی
پیشینہ عمر ہے جو باقی

بے ساغرِ مے خناک ہے جینا
رکھتا ہے شکون شراب پینا

لا بادۂ کہنہ سال نو ہے
سجدہ یہی با بتِ گرو ہے

دروازۂ میکدہ کھلا ہے
ہر پیر و جواں کو الصلا ہے

اینڈے ہے ہر ایک مست جوں تاک
لیتے نہیں نام دامنِ پاک

ہر غنچہ جام زیرِ سر ہے
ہر گوشے میں عالمِ دگر ہے

مستیِ نگاہ عقل دشمن
خوبیِ خرام مرد افگن

کہتے گئے صاحبِ کرامات
ہم بھی نہیں قابلِ خرابات

جو لوگ کہ اس جگہ سے اُٹھے
کب حلقہ و خانقہ سے اُٹھے

یاں پیتے ہیں جام بیخودی کا
ہے دور تمام بے خودی کا

مستی سے ہر ایک صبح صد بار
خورشید کا سر ہے اور دیوار

ہے قابلِ سیر خرقہ پوشاں
دریا دلِ شراب نوشاں

ان لوگوں کی ہر کمینہ صف میں
کشتی ہے شہ و گدا کے کف میں

ہر کوچے میں رہتی تھی منادی
تا رسمِ خردوری اٹھا دی

آزادوں کا ایک مقام ہوگا
وہ مرتبہ یاں مدام ہوگا

گو پُر ہو یہ دور پر کہاں تک
اک لغزشِ پا ہے یاں سے واں تک

بے خود ہو کہ یہ حجاب اُٹھے
دل یاں سے کہیں شتاب اُٹھے

پہونچیں ہیں فنا کو بیخودی سے
پاتے ہیں خدا کو بیخودی سے

پی جرعہ و ہوش کو دعا کہہ
ہر بادہ فروش کو دعا کہہ

جوشش میں ہے بادۂ کہن سال
عبرت ہو جسے خوش اُس کا احوال

اب دل میں مرے بھی جوش آیا
اب وقتِ وداعِ ہوش آیا
کھینچوں میں کہاں تلک دمِ سرد
ساقی وہ شرابِ شعلہ پرورد
وہ داروئے دردِ بے حضوراں
وہ مایۂ نورِ چشمِ کوراں
سرمایۂ عمرِ جاودانی
یعنی وہی آبِ زندگانی
وہ میوۂ خوش رسیدہ بارے
وہ عیشِ دلِ گزیدہ بارے
آئینۂ حسنِ خود پسنداں
زینت دہِ عنبریں کمنداں
وہ رنگِ رخِ بہار یعنی
وہ بادۂ خوش گوار یعنی
یاقوتِ گداز دادۂ عشق
یعنی کہ وہ جامِ بادۂ عشق
وہ لطف ہوا وہ سیرِ مہتاب
وہ شعلۂ غوطہ خوردہ در آب
وہ کامِ دلِ سبو بدوشاں
یعنی کہ وہی شرابِ جوشاں
وہ موجبِ دل خوشی کہاں ہے
وہ داروئے بے ہشی کہاں ہے
وہ جس کی طرف کو ہی تہ دل
یعنی وہ ہی شیشہ ماہ منزل
وہ آتشِ تیز آب آمیز
وہ عربدہ جو وہ فتنہ انگیز
وہ مقصدِ جانِ نا امیداں
وہ روسیہیِ روسفیداں
وہ رونقِ کارگاہِ شیشہ
وہ شوکتِ بارگاہِ شیشہ
وہ جس سے ہو توبہ ہو پریشاں
وہ جس سے ہو گفتگو پریشاں
وہ دامنِ خشک جس سے جل جائے
ثابت قدموں کا پاؤ چل جائے
وہ سرخیِ چشمِ خوب رویاں
اسبابِ خرابیِ نکویاں
وہ دلبرِ خود سرو شتابئیں
وہ رہزنِ راہ دین و آئیں
وہ جس سے غبارِ دل سے دھوؤں
مینا کے گلے سے لگ کے روؤں
مستی کی مجھے بھی خواہشیں ہیں
اس عقل سے دل کو کاہشیں ہیں

سلہ برگزیدہ پسندیدہ ۵۲ شوخ

لا اس کو جو آستین جھاڑوں — پھر ہاتھ چلے تو جیب پھاڑوں

بے ہوشِ شرابِ ناب رہیے — یوں تا بکجا کباب رہیے

ہی مستیِ بے خودی ضروری — کھل جائے مقامِ بے شعوری

دل غم سے بھرا ہی زور میرا — تا عرش گیا ہی شور میرا

ہی دل میں کہ گل کی اور رو[1] ہو — شیشہ ہو بغل میں اور تو ہو

ہر گام پہ لغزشِ قدم ہو — تکلیفِ شراب دم بدم ہو

جب سجدہ کناں ہوں صبح خیزاں — جب کاکلِ صبح ہو پریشاں

جب نکلے ستارۂ سحر گہ — کر نعرۂ الصبوح یک رہ[2]

ہی ذوقِ شرابِ صبح گاہی — بے لطف نہیں ہی روسیاہی

جب نشہ کی کچھ ترنگ آوے — مستی مجھے باغ میں لٹاوے

شیشہ مرے موہنہ کو تو لگا دے — کر ایسی نگاہ جو چھکا دے

جب بے خودیِ تمام آوے — سر پر مرے ہوش رکے جاوے

رخصت ہی تجھے کہ میں نہ ہوں گا — بے ہوش و خرد ہی پھر رہوں گا

بیٹھا تو کروں گا شکر تیرا — ہو ورنہ قبول عذر میرا

مقولہ

کیا میرؔ شراب تو نے پی ہی — بے ہودہ یہ گفتگو جو کی ہی

یا آبِ سیہ ترے قلم نے — یہ تجھ سے عجب کیا ہی ہم نے

تو کاہے کو اتنا ہرزہ گو تھا — کب درگروِ شراب تو تھا

بس موسے زبان اب نہ تر کر — مستیِ سخن پہ ٹک نظر کر

ہی نشۂ سامعہ دوبالا — پھر حرف نہ جائے گا سنبھالا

---

[1] گل کی طرف منہ ہو۔ [2] ایک بار

دنیا

(۹)

سنو اے عزیزانِ ذی ہوش و عقل ... کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل

پیمبر ہے شہ ہے کہ درویش ہے ... سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے

کہو گے کہ آگے تھا کہتا کوئی ... نہیں اس سرا بیچ رہتا کوئی

بجا[1] ہے کیا کوسِ رحلت تمام ... کنھوں نے نہ سمجھا سنا یاں مقام

یہ بیٹھے جو ہیں سامنے ہیں کہاں ... جہاں جملہ ہے ایک بزمِ رواں

جسے دیکھو چلنے کا گرمِ تلاش ... یہ منزل نہیں جائے بود اور باش

گدا ہو کہ ہو شاہِ عالی تبار ... تہہ خاک سب کا ہے دار القرار

نہ یک بوئے خوش ہی ہوا ہو گئی ... وہ رنگینیِ باغ کیا ہو گئی

ملے خاک میں جھڑ کے گلہائے تر ... پریشاں ہوئے مرغِ گلشن کے پر

پتنگوں نے گر خاک مسکن کیا ... چراغوں نے بھی خانہ روشن کیا

گئی خاک دامن فشانی کے ساتھ ... رہا آب سو بھی روانی کے ساتھ

وہی راکھ ہو کر اگر آگ تھی ... رکن ہے جہاں باد کی لاگ تھی

نہ جدول[2] رہے گی نہ سروِ رواں ... گلستاں کہاں ہیں گے ہو کا مکاں

زمیں کا رہے گا یہی کیا سبھاؤ ... لپیٹ جائیں گے آسماں جیسے تاؤ[3]

سکوں یاں کا دیکھا سراسر شتاب ... چلے جاتے ہیں کوہ جیسے سحاب

جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب ... نہیں جائے باش اور ڈھب ہے عجب

بھلا جی کے جلنے کا کیا ہے بیاں ... عیاں ہے کہ کہتے ہیں جاں کو رواں

جوانی گئی موسمِ شیب ہے ... شہود ایک دو روز[4] کو غیب ہے

۱۔ کوچ کا نقارہ بجا۔ مقام یعنی قیام کا نہیں بجا ۲۔ روش ۳۔ کاغذ کا تختہ ۴۔ یعنی میں

ہنسوں کیونکہ ہستی ہے دنداں نما
کہ ہو جائے دنداں ہی دنداں نما

گیا شور سر سے جھکا ہے بہت
گئی وا شداب دل رکا ہے بہت

نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام
مزا کچھ نہیں ہو چکی صبح شام

کریں لمس کیا ہر گھڑی ہے صُداع
نہیں لذت اکل و شرب و وقاع

بلا ارتعاشِ تنِ زار ہے
ہر ایک عضو چلنے کو تیار ہے

ہوا حافظہ بس کہ نسیاں کا صرف
نہیں یاد آتا ہے دوشینہ حرف

ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے
کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہائے

نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہے
سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے

نہیں گور کے کام سے کچھ فراغ
کسے ذوقِ صحبت کہاں وہ دماغ

نہ کچھ یونہیں عینک نظر چڑھ گئی
بصارت کی بے طاقتی بڑھ گئی

نہ رکھیے جو عینک نہ آوے نظر
سکے تو کہ اُٹھی ہیں ہم بے بصر

رہیں دیکھ منہ حرف زن ہو حریف
رہا سننے کے گوش نہ سمعِ شریف

صد افسوس لطفِ سماعت نہیں
صدا دور سے جیسے آوے کہیں

شباب آہ داغِ جگر دے گیا
قدِ خم زمیں کی طرف لے گیا

نہ کم زورِ بازو بہت کم ہوا
جھکا سر سو زانو کا ہمدم ہوا

جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی
سفیدیِ موئے سحر ہو گئی

بدن زار اعضا سبھی رعشہ دار
کرے کون خوباں سے بوس و کنار

جو یہ چال ہے جا رہے ہیں ہم اب
گھٹوں پر غرض آ رہے ہیں ہم اب

کھڑے ہوں تو تھرّائے ران و ساق
جئیں بیٹھے کیونکہ کہ جینا ہے شاق

جو یوں پاؤں چلتے پھسلتے رہے
تو دیکھو گے ہم یاں سے چلتے رہے

اگر ضعف سے چپ ہی رہتے ہیں ہم
یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم

۱؎ دانت [illegible] ۲؎ مسوڑے ۳؎ دانت کھولنے والے ۴؎ دردِ سر ۵؎ ہم صحبتی۔ یکجائی ۶؎ قابل ۷؎ کچھ سانس ہی باقی ہے ۸؎ زبانِ حال سب کچھ کہتی ہے

سکے ہیں نہیں اپنے تاک پا و دست — کیا خاک میں مجھ کو پیری نے پست
جو بازو ہیں اپنے سو بازو نہیں — اگر منھ کو دیکھو تو وہ رو نہیں
بدن کی ہوئی میرے صورت ہی اور — وے آنکھیں نہیں وے نہ چتون کے طور
جسد نا تواں جائے مہمان تنگ — سخن منھ پر آوے و داعی کے رنگ
لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ — در و بام پر حسرتوں سے نگاہ
شکن جلد میں دل کو پژمردگی — غریزی حرارت میں افسردگی
برودت بہت جسم میں آگئی — مزاجی تھی گرمی سو ٹھٹرا گئی
چھڑ کتا رہوں منھ پہ میں آب کاش — کہ ہوتا رہے روح کا انتعاش[1]
وگرنہ دیا سا بجھا جائے ہے — پھر اٹھ بیٹھوں تو جی جلا جائے ہے
سیہ روئے شیب اک ستم کر گیا — لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا

قلم رکھ دے کر میر ختم کلام
تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام

(۱) بیماری سے صحت

جھوٹ

(۱۰)

ای جھوٹ آج شہر میں تیرا ہی دَور ہی
شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہی

ای جھوٹ تو شعار ہوا ساری خلق کا
کیا شہ کا کیا وزیر کا کیا اہلِ دلق کا

ای جھوٹ تجھ سے ایک خرابی میں شہر ہی
ای جھوٹ تو غضب ہی قیامت ہی قہر ہی

ای جھوٹ رفتہ رفتہ ترا ہو گیا رواج
تیری متاع باب ہی ہر چار سو میں آج

ای جھوٹ کیا کہوں کہ بلا زیرِ سر ہی تو
ای جھوٹ سچ یہ ہی کہ عجب فتنہ گر ہی تو

ای جھوٹ کب ہی عرصہ میں تجھ سا حریف اب
تیرے ہی حکم کش ہیں وضیع و شریف اب

ای جھوٹ تیرے شہر میں ہیں تابعیں سبھی
مر جائیے کیوں نہ کوئی شے بولیں نہ سچ کبھی

کہنے ہے آج ان کے کوئی دل شاد ہو
فردا کہیں تو اس سے قیامت مراد ہو

وعدے گھڑی کے پہروں کے سب آزما چکے
برسوں تک انتظار کیا جی ہی جا چکے

ای جھوٹ رنگ تیرے کرے کوئی کیا بیاں
رکھتا ہی جیسے غنچہ زباں تو تہہ زباں

یوسف کہ تھا نبی و صداقت شعار تھا
پھر حسن ظاہری سے بھی باغ و بہار تھا

پایانِ کار تیرے سبب چاک پیرہن
زنداں میں جا کے برسوں رہا چھوڑ کر وطن

ای جھوٹ تو تو ایک دلاویز ہی بلا
آشوب گاہ تجھ سے زمانہ سدا رہا

بس جاں کنی سے کوہ کنی کوہ کن نے کی
تصویر خسرو و شیریں کی پیش نظر رکھی

نزدیک جب ہوا کہ وہ مطلوب سے ملے
اب صبح و شام غنچۂ مقصودِ دل کھلے

دلالہ کے تو پردے میں آ کام کر گیا
دو باتوں میں وہ عاشق دل خستہ مر گیا

ای جھوٹ تجھ سے فتنے ہزاروں اُٹھا کیے
ہنگامہ و فساد ہی ہر سو رہا کیے

ای جھوٹ راستی سے نہیں گفتگو کہیں
کہنے کو ہاں کہیں ہی حقیقت میں ہی نہیں

ای جھوٹ اس طرح ہیں بہت جی سے جا چکے
وعدوں ہیں آہ لوگوں کے وعدے ہی آچکے

ای جھوٹ اس زمانے میں کیونکہ سچ چلے معاش
ہی تنگ جھوٹ بولنے سے عرصۂ تلاش

سروار جس سے سب متعلق ہی کار و بار
سچ بولنا ہی اس کے تئیں سخت ننگ و عار

پھر سب مدار کار دروغی و مفتری
صدق و صفا و راستی کے عیب سے بری

مشکل حصول کام ہی یاں حاصل کلام
باتوں ہی باتوں کام ہوا خلق کا تمام

ای جھوٹ دل مرا بھی بہت دردناک ہی
ان کا ذبوں سے صبح نمط جیب چاک ہی

گھر کا حال

(۱۱)

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال — اس خرابے میں میں ہوا پامال
گھر کا تاریک و تیرہ زنداں ہے — سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے
کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ — کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ
چار دیواری سو جگہ ہے خم — تر تنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی — آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی
کیا تھے مینہ سقف چھلنی تمام — چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام
اس چکش کا علاج کیا کریے — رات کو کب تلک کھڑے پھریے
جا نہیں بیٹھنے کو گھر کے بیچ — ہے چکاسش سے تمام ایواں کیچ
آنکھیں بھر لاکے یہ کہیں ہیں سب — کیونکہ پردہ رہے گا یارب اب
جھاڑ باندھا ہے مینہ نے دن رات — گھر کی دیواریں ہیں گی جیسے پات
بادیں کانپتی ہیں جو تھر تھر — اِن پہ ردّا رکھے کوئی کیونکر
کچھ لے لے کے بارے چھوپا ہے — چھوپنا کاہے کا ہے تھوپا ہے
تسکو پھر پرچھتی بھی ہے ہی نہیں — ٹوٹا اک بوریا سا ڈالو کہیں
ڈھانکو دیوار یا اٹھا رکھو — یا ہمارے لیے چھپا رکھو
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق — سو شکستہ تر از دلِ عاشق
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک — کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیری سی ہے خاک
کہیں گھوسوں نے کھود ڈالا ہے — کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا — شور ہر کونے میں ہے مچھر کا

کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
کوئی ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے
آگے اس حجرے کے ہے اک ایوان وہی اس تنگِ خلق کا ہے مکان
کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے کوئی واسا کہیں سے چھوٹا ہے
دب کے مرنا ہمیشہ مدِ نظر گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
مٹی تودہ جو ڈالے چھت پر ہم تھے جو شہتیر جوں کماں ہیں خم
اینٹ مٹی کا ڈر کے آگے ڈھیر گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر
کیونکہ ساون کٹے گا اب کی بار تھرتھراوے بھنبیری سی دیوار
ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب اُڑ بھنبیری کہ ساون آیا اب
تیزی یاں جو کوئی آتی ہے جانِ محزوں نکل ہی جاتی ہے
نہیں وہ زاغ چار پاؤں پھرا ایک کالا پہاڑ آن گرا
مٹی اس کی کہیں کہیں سے کھسکی جی ڈوبا[۵۴] اور چھاتی بھی دبکی
سان کر خاک لگ گئے دو چار بارے جلدی درست کی دیوار
اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے برسے ہے یک خرابی گھر در سے
ایک چھپر ہے شہرہ دلی کا جیسے روضہ ہو شیخ چلی کا
بانس کی جا دیئے تھے سرکنڈے سو وے میہوں میں سب ہوئے ٹھنڈے
گل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب پا کھڑے رہنے لگے ہیں گیلے سب
مینہ میں کیوں نہ بھیگیے یکسر پھوس بھی تو نہیں ہے چھپر پر
واں پہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا

۵۴ بجائے ڈوبا

ٹپکے دو چار جا تو بند کروں
بیچ کوئی لڑاؤں قند کروں

یاں تو چھانکے ہزار ہیں تنہا
کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا

بس کہ بد رنگ ٹپکے ہے پانی
کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی

کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں
کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلا ہوں

پوچھ مت زندگانی کیسی ہے
ایسے چھپر کی ایسی تیسی ہے

کیا کہوں جو جفا چکش سے ہی
چارپائی ہمیشہ سر پہ رہی

بور یہ پھیل کر بچھا نہ کبھو
کونے ہی میں کھڑا رہا یکسو

جنبش اسکے کوئی کھٹولا کھاٹ
پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی
چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی

سب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں
سر پہ روزِ سیاہ لاتا ہوں

لیٹا ایک ایک پھر مکوڑا ہے
سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا
پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ہاتھ تکیے پہ گہ بچھونے پر
کبھو چادر کے کونے کونے پر

سلسلا پا جو پائینتی کے اور
وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور

تو شکاں ان کے گڑوں ہی میں سب پھاٹ
ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی

ایک ہتھیلی میں ایک گھائی ہیں
سیکڑوں ایک چارپائی میں

ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہیے
کب تلک یوں ٹٹولتے رہیے

دو طرف سے تھا کتوں کا رستا
کاش جنگل میں جاکے میں بستا

ہو گھڑی دو گھڑی تو دُتکاروں
ایک دو کتے ہوں تو میں ماروں

چار جاتے ہیں چار آتے ہیں
چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں

کس سے کہتا پھروں یہ صحبت نغز
کتوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز

لہ بجائے حق۔ چال

وہ جو ایواں[1] تھا جرے کے آ گئے — اس کے اجزا بکھرنے سب لاگے
کوٹھا بوجھل ہوا تھا بیٹھ گیا — پانی جڑ جڑ میں اس کی بیٹھ گیا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا — ناگہاں آسمان ٹوٹ پڑا
میں تو حیران کار تھا اپنا — کوئی اس دم نہ یار تھا اپنا
اینٹ پتھر تھے مٹی تھی یکسر — خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر
چرخ کی کجروی نے پیسا تھا — پر خدا میرا مجھ سے سیدھا تھا
کتنے اک لوگ اس طرف دھائے[2] — یا ملک آسمان سے آئے
مٹی لے لے گئے وہ ہاتھوں میں — کام نے شکل پکڑی باتوں میں
صورت اُس لڑکے کی نظر آئی — ہم جو مردے تھے جان سی آئی
آنکھ کھولی اِدھر اُدھر دیکھا — اس خرابے کو بھر نظر دیکھا
قدرتِ حق دکھائی دی آکر — یعنی نکلا درست وہ گوہر
داشت کی کوٹھری میں لا رکھا — گھر کا غم طاق پر اُٹھا رکھا
مومیائی کھلائی کچھ ہلدی — فرصت اس کو خدا نے دی جلدی
غم ہوا اُن کے دوست داروں کو — پھر بندھا یہ خیال یاروں کا
کہ مری بود و باش یاں نہ رہے — گو تصرف میں یہ مکاں نہ رہے
شہر میں جا بہم نہ پہنچی کہیں — چار ناچار پھر رہا میں وہیں
اب وہی گھر ہے بے سر و سایہ — اور میں ہوں وہی فرومایہ
دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس — خواب راحت ہے یاں سے سو سو کوس
قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں — رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں
نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا! — گھر ہی کا ہے کا نام ہی گھر کا

---

[1] نسخۂ سنہ ۱۲۲۵ھ [2] دھائے پڑے۔ دوڑ کر آ گئے۔

ہجو خانۂ خود

(۱۲)

جسم خاکی میں جس طرح جاں ہی
اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہی

ظلمتیں اس کی سب پہ روشن ہیں
زندہ درگور ہم کئی تن ہیں

ہی جو سرکوب اک بڑی دیوار
واں سے جھانکو تو ہی اندھیرا غار

بخت بد دیکھ سارے پرنالے
اس کے معمار نے ادھر ڈھالے

اب جو آیا ہی موسمِ برسات
دن کو ہی اپنے ہاں اندھیری رات

صحن میں آب نیزہ بالا ہی
کوچہ موج ہی کہ نالا ہی

مینہ میں گھر کے پانچ چھ چھپر
ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر

پر تنک تنکے تھے کچھ ایک نئے
سو وے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے

دل ہی کچھ مکڑیوں کا احسان مند
کہ جنھوں نے کیے ہیں جھانکے بند

پھوس کچھ ہی کہیں سو آتا ہی
بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہی

اڑ گئی گھاس مٹی ہی ڈالا
ہی جو بندھن سو مکڑی کا جالا

اپنے بندھن سے جو کہ چھوٹا ہی
ہم پہ گویا وہ بانس ٹوٹا ہی

کیا کہوں آہ گھر ہی کہنے کو
باندھتا ہوں مچان رہنے کو

بند جھانکوں کو کیجیے تا کے
یاں تو اک آسمان ٹوٹا ہی

ٹھیکے دینے کو جا اڑے ہیں ہم
سر پہ ٹھٹر لیے کھڑے ہیں ہم

ٹٹیاں تھیں جو آگے چھپر کے
بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے

تا گلو سب کھڑے ہیں پانی میں
خاک ہی ایسی زندگانی میں

ابتو اپنا بھی حال ہی بد تر
سر پہ گٹھڑی ہی تس پہ ہی چھپر

---

[1] باریک ریشمی کپڑا

پانی بہہ کر جھکا جو ہر دالان
سر پہ رہتا ہے طرہ ایوان

چاک اس ڈول سے ہے ہر دیوار
جیسے چھاتی ہو عاشقوں کی فگار

متصل ٹپکے ہے نہ باران ہے
گریہ زار سوگواران ہے

گھر کی صورت جو اور ہوتی ہے
چھت بھی بے اختیار روتی ہے

مینہ یکبارگی جو ٹوٹ پڑا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا

واسے پایان کار ٹوٹ گئے
طاقچے بھر رہے تھے پھوٹ گئے

بہہ گئے کوئی تختے ڈوب گئے
غرض اجزائے سقف خوب گئے

موج خشتی ستون میں بیٹھی
جان غمناک خون میں بیٹھی

لے گیا پیچ و تاب پانی کا
کوٹھری تھی حباب پانی کا

یوں ڈھہا گھر کہ بار خاطر تھا
آہ کس کا غبار خاطر تھا

اکھڑی دہلیز سب منڈیر گری
لہر پانی کی جھاڑو دیتی پھری

ساری بنیاد پانی نے کاٹی
اینٹ کے گھر کو کر دیا ماٹی

جھک گئے سب ستون در بیٹھا
وہی چھپر کھڑا ہے گھر بیٹھا

برسات کی شکایت

(۷۸)

کیا کہوں اب کے کیسی ہے برسات
جوشِ باراں سے بہہ گئی ہے بات

بوند تھمتی نہیں ہے اب کے سال
چرخ گویا ہے آب در غربال

وہی یکساں اندھیر برسے ہے
آسمان چشم وا کو ترسے ہے

ماہ و خورشید اب نکلتے نہیں
تارے ڈوبے ہوئے اچھلتے نہیں

آب میں کوئی بولتا ہی نہیں
آسمان دیدہ کھولتا ہی نہیں

چرخ تک ہو گیا ہے پانی جو
ماہ و ماہی ہیں ایک جا ہر دو

لے زمیں سے ہے تا فلک غرقاب
چشمۂ آفتاب ہیں گرداب

خشک بن ابکی بار سبز ہوئے
موشِ دشتی کے خار سبز ہوئے

ابر کس کس سیاہ مستی سے
ہوتے جا[۵] ہیں بلند پستی سے

ابر کرتا ہے قطرہ افشانی
پانی پانی رہے ہے بارانی

تنگ آبی سے جان مت[۶] اغراق
ڈوبنے پر ہے کشتیِ آفاق

عقل مینہوں نے سب کی کھوئی ہے
بات باراں نے یاں ڈبوئی ہے

کیسا طوفان مینہ چھپایا ہے
زخمِ دل نے بھی اب اٹھایا ہے

بیٹھے اٹھتے نہیں ہیں بام و در
یہ خرابی ہے شہر کے اندر

سقف آماج بوند پیکاں ہے
مینہ ہے یا کہ تیرِ باراں ہے

جیسے دریا ابلتے دیکھے ہیں
یاں سو پرنالے چلتے دیکھے ہیں

ابر رحمت ہے یا کہ زحمت ہے
ایک عالم غریقِ رحمت ہے

لیے گئے ہیں جہان کو سیلاب
نقشہ عالم کا نقش تھا بر آب

۵ جاتے ہیں　　۶ مبالغہ

نہ ہی جلسہ نہ ربطِ یاراں ہے
شہر میں ہے تو باد و باراں ہے

روز و شب یاں ہمیشہ جھمکا ہے
اِن دنوں رنگِ برق چمکا ہے

وسعتِ آب پوچھ مت کچھ یار
کوچے موجوں کے ہوگئے بازار

شعر کی بحر میں بھی ہے پانی
بہتی پھرتی ہے اب غزل خوانی

لائی بارندگی کی چالاکی
آبِ خشکابِ گہر پہ ملنا کی

مست ہو ہو گئے ہیں مستِ شراب
غوطے کھاتے پھریں ہیں عالمِ آب[1]

مستی ہے اب جو چاہیں سیرابی
بطِ مے تو ہوئی ہے مرغابی

دشتِ غم اس قدر یہ طغیاں ہے
کہ ہر اک گوشے بیچ طوفاں ہے

جزر و مد جس کا تا فلک جا ہے
جو ہے تالاب قہر دریا ہے

ہر طرف ہیں نظر میں ابر سیاہ
پانی ہے جس طرف کو کریئے نگاہ

سیلہا در رکاب دیدہ ہاست
چشم تا کار می کند دریاست

خضر کیونکر کے زیست کرتا ہے
آبِ حیواں میں پانی مرتا ہے

کیا لکھے میرؔ مینہ کی طغیانی
ہوگئی ہے سیاہی بھی پانی

[1] پانی کی حالت جاننے والے۔

برسات کا سفر

(۱۴)

ابر ہونے لگے سفید و سیاہ
پانی رستوں میں کچھ ساری راہ

بیچ میں ہوتے کچھ اگر اسباب
منھ اُٹھانے کی جی میں ہوتی تاب

سو تو کمّل نہ پٹو نہ لوئی
سایہ گستر نہ ابر بن کوئی

ابر بھی بیکسی پہ روتا تھا
ابر ہی سر کا سایہ ہوتا تھا

آسماں آب سب زمیں سب کیچ
خاک ہی ایسی زندگی کے بیچ

شب کہ دریا پہ ہو کے راہ پڑی
پانی کی سطح پر نگاہ پڑی

لُجّی لطمی کا کیا کہوں میں اوج
باتیں کرتی ہو آسماں سے موج

ہوش جاتا تھا دیکھ جوشِ آب
گوش کرتا تھا کر خروشِ آب

آب نہ دار اور تیرہ بہت
لہر اُٹھتی جو تھی سو خیرہ بہت

پانی پانی تھا شور سے طوفان
دیکھ دریا کو سوکھتی تھی جان

ہمرہ موج سیکڑوں گرداب
ساتھ تھی صدتری کے چشم حباب

ناؤ میں پاؤں ہم نے بارے رکھا
خوف کو جان کے کنارے رکھا

جذر و مد سب حواس کھوتا تھا
خضر کا رنگ سبز ہوتا تھا

موج اُٹھنے لگی جو طوفاں زا
کچھ نہ آیا نظر سو عماں زا

کیا کہیں ڈوب ہی چلے تھے ہم
ناخدائی خدا نے کی اس دم

بلّی لگتی نہ تھی نہ کچھ تھی تھاہ
عقل گم کردہ لوگ تھے ہمراہ

ریلا پانی کا جب کہ آتا تھا
خوف سے جی ہی ڈوب جاتا تھا

خطرِ غرق سے تھی طاقت طاق
بیخودی سے ہوا تھا استغراق

۵۱ موجوں کے تھپیڑے

بہتے پھرتے تھے خضر کشتی پاس
غوطے کھاتے تھے حضرتِ الیاس

بد بلا سے تھے ہم کنارہ ہوئے
تھا خدا ہی تو پلّے پار ہوئے

کسو درویش کا تھا یُمن قدم
جا کے پہونچے جو اس کنارے ہم

ورنہ اعمال نے ڈبویا تھا
گوہر جاں سے ہاتھ دھویا تھا

اُس کنارے کا جو اثر پایا
ہم طلاطم کشتوں میں جی آیا

باؤ جنگل کی تند کچھ نہ رُکاؤ
مینہ میں چل پڑے تو کانپے جاؤ

باؤسی دن میں سائیں سائیں کرے
رات ہوئے تو بھائیں بھائیں کرے

آس پاس اُس گڑھی کے آئی جھیل
گم تھے برسات میں طریق و سبیل

ایدھر اودھر اُتر کے پانی جاؤ
قہر ہی پھر جو ٹک بھی ہووے چڑھاؤ

اس سے واں کی ہوا بہت مرطوب
ہووے نزلہ زکام بے اسلوب

کتنے روزوں میں ہوتی ہے کھانسی
ایسی جیسے گلے میں وہیں پھانسی

پھر وہ درجہ ہے جس میں ہووے دق
یہ کوئی نکلی ایک ثالث شق

نہ کوئی دادرس نہ وقت داد
مفت ہی ہم گئے تھے سب برباد

کیا کڈھب چرخ کج نے پھینکا تھا
پر خدا کچھ ہمارا سیدھا تھا

جنّے قدرت نمائی کی اپنی
اُس بلا سے رہائی کی اپنی

بس قلم ہے صریر تیزیِ تند
شور سے تو پڑا جہاں میں دُند

بد زبانی کا مجھ کو کب ہے دماغ
ایسی باتوں سے ہیں کیا ہے فراغ

ہو چکی صاحبوں کی فرمایش
چپ رہ اب ہے زمانِ آسایش

شادی نامہ

(۱۵)

ہے جہانِ کہن تماشا گاہ
آصف الدولہ کا رچا ہے بیاہ

آؤ ساقی کہ کد خدائی ہے
طبعِ نواب ادھر کو آئی ہے

نئے سر سے جواں ہوا ہے جہاں
عیش و عشرت کے محو خورد و کلاں

ہر طرف شہر میں ہے آرایش
رہ رواں کی نہیں ہے گنجایش

شیشہ بازِ فلک ہے آتشباز
کہکشاں سے ہوا ہوائی ساز

ماہ سے ماہتاب کی ہے طرح
کس سے ہو لطفِ روشنی کی شرح

نہیں رستوں میں روشنی کے دیئے
انجم ہے چشم روشنی کے لیئے

شبِ شادی کی دھوم کی کیا بات
روزِ روشن تھی روشنی سے رات

دو طرف چھوٹتے جو ہیں گے انار
راہ رستے ہوئے ہیں باغ و بہار

آؤ ساقی کہ جمع ہیں احباب
سب مہیّا ہیں عیش کے اسباب

لاوہ جوں آفتاب ساغرِ زر
آبِ گلرنگ سے لبالب کر

آج جھوما ہے ابرِ بخشش زور
کچھ نظر ہے تجھے ہوا کی اور

دستِ دستور ابرِ نیساں ہے
یعنی یکدست گوہر افشاں ہے

کر چمن زارِ دست و دل کی سیر
ہیں نہال آج آشنا و غیر

گل نمط دل شگفتہ سب کے کیئے
خلعتِ فاخرہ سبھوں کو دیئے

لا کہاں ہے وہ لالہ رنگ شراب
جس سے مستِ گزارہ ہوں احباب

آئے مطرب لیئے رباب و چنگ
کاڑھو منہ سے نوائے شیر[1] آہنگ

ہر طرف رقص میں ہیں گلرویاں
پائے کوباں ہیں سلسلہ مویاں

سلہ شیر علاوہ دودھ کے شیرینی اور شراب کے معنی میں بھی آتا ہے۔

شادمانی سے ہو نوائے دراز — دے بہار گزشتہ کو آواز
گل و لالہ سے چشم باز کرے — رنگ صحبت کو دیکھ ناز کرے
چھیڑ سازِ طرب نوا کے تئیں — باندھ آواز سے ہوا کے تئیں
وجد میں لا تو مے پرستوں کو — یاد دے ٹک سرود ستوں کو
آؤ ساقی کہ روشنی ہی خوب — محوِ آرایش آج ہیں محبوب
کاغذیں باغ کیا تماشا ہے — پھول کترا کہ گل تراشا ہے
شیشہ شیشہ شراب ہے درکار — صحبتِ عیش کو چھکا یک بار
لالہ رنگِ رُخ نکویاں کو — مایۂ نازِ خوب رویاں کو
اُس پری کو نکال شیشے سے — رنگ مجلس میں ڈال شیشے سے
ہوکے سرمست، ہو تماشائی — حکم کش ہے سپہرِ مینائی
چھوڑ آئین بُردباری کا — سیر کرلے ترک سواری کا
چل گلابی کو ہاتھ میں لے لے — ایک دم جام متصل دے لے
ہے سواری کی فیل کی وہ دھوم — جیسے ابر بہار آوے جھوم
آئے دولت سرا سے ہوکے سوار — لعل ناب و گہر ہیں صرف نثار
اک مہابت کے ساتھ فیل فشاں — آگے مانند کوہِ زر کے رواں
اور ہاتھی ہیں جھومتے جاتے — جیسے آویں جوان مدماتے
جھول زربفت کی ہے ساری شب — روکشِ انجمِ فلک ہیں سب
پلٹنیں جاتی ہیں برابر یوں — صف ہو مژگانِ دلبران کی جوں
یال بستہ رکاب میں ہیں سرنگ — جن کے دیکھے کمیتِ چرخ ہے دنگ
خوش سواری و خوش جلو خوش راہ — باگ اُچکی تو پھر نہ ٹھہری نگاہ
گردنوں میں پڑی حمائل گل — ہیں جلو میں بصد شمائلِ گل

۱؎ یاد دہانی کر۔ سرود بستاں یاد دہاں۔ ۲؎ تیزی و چستی جس لیے ترکتاز مشہور ہے۔ ۳؎ زرق برق لباس والوں کی وجہ سے راستہ زرنگار

تھا بہت تیز گام اسپِ خیال
رہ گیا دیکھ کر انھوں کی چال

تھے پری زاد چھیڑے اُڑجاویں
آنکھ پھیرو توکل سے مڑجاویں

کسمسانے ہیں باؤ سے آگے
ہاں کہے جیسے وہم جا لاگے

پھینکتے ہیں جو دستہ دستہ گل
رہ گزر میں ہیں رستہ رستہ گل

ساقیا دے وہ مے جو باقی ہے
شادی ایسی بھی اتفاقی ہے

ہو مبارک یہ جشنِ خوش انجام
دورِ گردوں بکامِ عیش مدام

ہولی

(۱۶)

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
شیشہ شیشہ رنگ صرفِ دوستاں
اُس چمن سے باغ پر گل سرخ و زرد
پھول گل آویں نظر دیکھو جدھر
دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں
زعفرانی رنگ سے رنگیں لباس
رنگ افشانی سے پڑتی تھی پھوار
مرغ گلشن گل رخاں کو جان پھول
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال
برگ گل ملواں اُڑاتے تھے عبیر
ٹٹیاں دریا کی باندھے دو طرف
تھا جہاں تک آبِ دریا کا بہاؤ
ایک عالم دیکھتا ہو دور سے
سوانگ کیا کیا بن کے آئے درمیاں
کیسی کیسی دیکھیں شکلیں نازیاں
کشتیوں میں جو دیئے بھر کر چلے
منعکس تھے جو چراغاں تہ تلک
کیا ہوائی چھوٹنے کا ہو بیاں

رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر
صحنِ دولت خانہ رشکِ بوستاں
نکہت گل جھاڑے گی واں آ کے گرد
لالہ و صد برگ سب باغ نظر
جیسے گلدستے تھے جوں ہم رواں
عطر مالی سے سبھوں میں گل کی باس
رنگ باراں تھا مگر ابرِ بہار
بیٹھتے ہیں پاس آ کر پھول پھول
جس کے لگتا آن کر پھر منہ ہو لال
تھی ہوا میں گرد تا چرخ اثیر
کیا چراغاں آسماں کی ہو طرف
واں تلک تھا آبِ دریا کا دکھاؤ
رات دن تھی روشنی کے نور سے
دیکھنے کا سوانگ تھا سارا جہاں
سحر کرتے تھے کہ صورت بازیاں
پانی میں شعلوں کے ریلے ہی چلے
آب کی وسعت تھی بر نجم فلک
ذو ذنب جیسے ستارے ہوں عیاں

۵۱ بلند ۵۲ ان ٹٹیوں کا مقابلہ آسمانی چراغاں کی روشنی نہیں کر سکتی ۵۳ دم دار

کنج چھوٹے ایک سے روشن تھے جھاڑ
دو طرف جس طرح سے جھڑتی ہے باڑ

اک روش سے تھے ستارے چھوٹتے
ناگہاں جو ہوویں تارے ٹوٹتے

دیکھے جاتے تھے چراغاں آب میں
شعلے تھے لہروں کے پیچ و تاب میں

ہر دو جانب چن گئے ناری انار
گلفشانی سے اُنھوں کی تھی بہار

ماہتابی اک طرف سے جو دغی
چاند سا نکلا ہوے حیراں سبھی

آفریں صناع لوگوں آفریں
کیا لگایا باغ آکر کاغذیں

گل کتر کر پھول گل ہی کر دیئے
رنگ تانے کا غذوں میں بھر دیئے

متصل تو ہیں ستاروں کی دغیں
لوگوں کی آنکھیں فلک سے جا لگیں

دیکھیاں کیا کیا نہ شعلہ خیزیاں
تھیں ہوا میں سے ستارہ ریزیاں

عرصہ گل ریزی سے گلشن ہو گیا
چرخ ان تاروں سے روشن ہو گیا

داغیاں تو ہیں ہوائی ایک بار
پھیلے تارے آسماں میں بے شمار

کیا ہوائی باد میں لہرا گئے
تارے سانپوں کے سے من بہلا گئے

کیا ہی آتش دستیاں شے کر گئے
شعلوں سے پانی کی لہریں بھر گئے

رحمت اے آتش زناں کیا لاگ ہے
کہ بساط آب دریا آگ ہے

ہولی

(۱۷)

آؤ ساقی شراب نوش کریں — شور سا ہی جہاں میں نوش[1] کریں

آؤ ساقی بہار پھر آئی — ہولی میں کتنی شادیاں لائی

شادیاں بے شگوں سراسر ہیں — کوچے سو شہر کے برابر ہیں

دستِ دستور ہی جو زر افشاں — پھر جہاں کہن ہوا ہی جوان

دونوں رستے عمارت خوش ہی — تازہ کاری شہرِ دلکش ہی

زور بازاری رنگ لائے ہیں — سارے رنگیں ستوں لگائے ہیں

جس طرف دیکھو معرکہ سا ہی — شہر ہی یا کوئی تماشا ہی

چشمِ بد دور ایسی بستی سے — ہی مقصد ہی ملکِ ہستی سے

لکھنؤ دلی سے بھی بہتر ہی — کہ کسو دل کی لاگ ایدھر ہی

آئین[2] بستہ ہوا ہی سارا شہر — کاغذیں گل سے گلستاں ہی دہر

ایسے گل پھولے ہیں جو صرفِ کار — راہ رستے ہوئے ہیں باغ و بہار

بستہ آئیں دکانیں ہیں یکسر — جن میں سستی متاعِ لعل و گہر

میوۂ نورس و رسیدہ بہت — گل خوش رنگ و بوئے چیدہ بہت

شبِ شادی کو لڑکے ہوں جو سوار — لیں صغیر و کبیر بہرِ نثار

تختِ بہرِ زنانِ رقص کناں — چھٹے رستوں میں بے چنیں و چناں

گلِ کاغذ سے شہر ہی گلزار — تو کہے آئی ہی بہار اے یار

ساقیا عیش کا ہو بزم آرا — سارے لوگوں میں جام ہی کو پھرا

جس میں تہ[3] پاوے اس پری کو دے — ورنہ شیشے کی شیشے میں رکھ لے

[1] نوش کے معنی شیریں بھی ہیں اس لیے شور کے مقابلے میں اس رعایت سے بھی فائدہ اٹھایا ہی۔ [2] آئین بستہ ہوا — آراستہ ہوا۔ [3] تہ — شراب

ہوگی مجلس جو مستِ آسایش
کون دیکھے گا لطفِ آرایش

آؤ ساقی قرار ہے باہم
کہ تماشا کناں پھریں خرم

زنِ رقاص پر نگاہ کریں
کسو سادے[51] سے چل کے راہ کریں

کسو دلبر کے کھینچ لیویں ہاتھ
کسو محبوب کو اٹھا لیں ساتھ

کسو خوش رو کے منھ پہ منھ رکھ لیں
کنج لب کا کہیں مزا چکھ لیں

خوش تنوں سے کریں ہم آغوشی
کسو نازک بدن سے ہم دوشی

کہیں دو جام مے سے ہوں سرمست
جائیں گے تھوڑی دور دست بدست

مچلے بن جائیں گے کسو کو دیکھ
پھیر آگے کسو کے رو کو دیکھ

اب گلابی پئیں گے بھر بھر ہم
باقی ساقی پئیں گے پھر کر ہم

کہیں آرایش آکے دیکھیں گے
کاغذیں باغ جاکے دیکھیں گے

کسو مہوش سے ہوویں گے گلباز
کھینچیں گے ایک دو دم کے اس کے ناز

آؤ ساقی مئے دو آتشہ دے
اسی مے کا بغل میں شیشہ دے

گرم ہو جو دماغ انساں کا
لطف آوے نظر چراغاں کا

جس طرف دیکھیے چراغاں ہے
شیشہ و شمع ہی نمایاں ہے

باغ سے روشنی ہوئی ہے زیاد
ہے یہ ہنگامہ تا جلال آباد

شمع و فانوس کا بہت ہے ہجوم
شمع رنگوں نے کر رکھی ہے دھوم

لوٹیے ان گلوں کی اب تو بہار
گو کسو کے گلے کا ہو جیئے ہار

اب تو او دھم ہی مچ گیا ہر سو
دارو پی کر پھریں چلیں ہم تو

تارے سے ہیں چراغ چار طرف
آسماں پر زمیں رکھے ہے شرف

غنچہ غنچہ دیوں[52] کو دیکھیں جہاں
کسو نو گل سے رکھیں صحبت واں

کہیں نوبت کو چل کے سنیے گا
نَے کے بجنے پہ سر کو دھنیے گا

[51] بھولا بھالا۔ امرد [52] چراغوں کو

نوبتی خوش سلیقے سارے ہیں
نَے نوازوں نے جان مارے ہیں

آج نوبت کے بجنے پر ہے رنگ
عقل ہوتی ہے سُن ٹکورے دنگ

جھانجھ کے سننے کی رہی ہے جھانجھ
صبح جوں تُوں کے ہم کریں ہیں سانجھ

بیچ میں ہولی آئی ہے ساقی
پھریئے سر خوش[1] ہی تا کہے باقی

شیشہ شیشہ شراب اب پیجے
بلکہ خُم منھ لگا کے سب پیجے

سیر کریئے کنارِ نہر و گشت
لالہ و گل کھلے ہیں تا سرِ دشت

انھیں پھولوں کے انعکاس سے آب
تو کہے لالہ رنگ سب ہے شراب

سبدِ گل ہوئی ہے ہر کیاری
ایک ہے گل زمین زمیں ساری

درمیاں یک شجر نہیں بے برگ
ہے ہزارہ کہ لالۂ صد برگ

جوشِ لالہ سے تا اُلنج[2] و سنگ
شفقی ہو گیا ہوا کا رنگ

تخت کیونکر نہ ہو داغِ خاک
دشت در دشت ہے گلِ تریاک[3]

پھر لبا لب ہیں آبِ گیر رنگ
اور اُڑے ہے گلال کس کس ڈھنگ

پاس آتے ہیں مرغِ گلشن پھول
تھے وے دلبر گلاب کے سے پھول

پگڑیاں جامہ بھیگی سو سو ہیں
ان کو گلہائے تر کہیں تو ہیں

چھڑیاں پھولوں کی لبروں کے ہاتھ
سیکڑوں پھولوں کی چھڑی سے ساتھ

قمقمے بھر گلال جو مارے
مہوشاں لالہ رُخ ہوئے سارے

خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں
گل کی پتی ملا اُڑاتے ہیں

جشنِ نوروزِ ہند ہولی ہے
راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

عشق ہے ای گروہ آتش زن
دونوں رستے چراغ ہیں روشن

درِ دولت سے لیکے تا سرِ آب
ہے چراغ اور شمع ہے گی تاب

پھر سرِ پل سے تا عمارتِ نو
جلتے ہیں مجتمع دیئے ستو ستو

[1] نشہ کا ابتدائی درجہ حار در جوش [2] النار کا معرب بمعنی ہمزہ زا . [3] پوست یعنی خشخاش کے پھول یعنی افیون کے نشہ میں زمین کا داغ تخت شاہی ...

آؤ ساقی پلا شراب ہمیں
روشنی کی نہیں ہی تاب ہمیں

روشنی بھی ہی کوئی ہنگامہ
سیر ہیں گرم ہو گیا جامہ

گرمی سے مشعلوں کی آئے تنگ
دودِ مشعل ہی جائے کاہی رنگ

دو طرف سیم بندی کردی ہی
سونے روپے سے راہ بھردی ہی

شمعیں لاکھوں کنول میں ہیں روشن
زور پھولا ہی کاغذیں گلشن

واہ آتش زبانِ آتش دست
دارو پی کر پھرو ہو کیسے مست

توپیں کیا ڈھالی ہیں ستاروں کی
کھوئی رونق فلک کے تاروں کی

ماہ بھی چشمِ روشنی کے لیے
ہی چراغاں ستارگاں سے کیے

گنج چھوٹے ہیں باکہ باڑ جھڑی
یا ہوائی ہی جگنیوں کی چھڑی

گل فشاں ہیں پڑی جو پھلجھڑیاں
کھلتیاں ہیں دلوں کی گلچھڑیاں

چھوٹتے ہیں انار مہتابی[1]
رنگ ہیں دلبروں کے مہتابی[2]

باؤ سے دو دیے ہوئے گرمانر
دغیں مہتابیاں کہ نکلے چاند

آہ ساقی مجھے قرابہ دے
در بغل شیشہ ساتھ اپنے لے

بحرِ بخشش کی ہر یہ اب آئیں
زر و گوہر کی کشتیاں لائیں

ہی بلند اس کرم کا کیا پایہ
دیتے ہیں خلعتِ گراں مایہ

کیا بچھا ہی فراخ دسترخوان
جس پہ ہی خلق یک جہاں مہماں

کس کو اسباب یہ میسّر ہیں
ظرف سیمیں و جب[3] زر ہیں

ہیں جو مہمان بادشاہ و گدا
حرص دونوں کی سیر ہی یکجا

عمر و دولت ہو اس کی حد سے زیاد
ہو اسی سے جہاں نشاط آباد

۱؎ اسم ۲؎ صفت ۳؎ سرپوش

صیدنامہ اول

(۱۸)

چلا آصف الدولہ بہرِ شکار
نہادِ بیاباں سے اُٹھا غبار

روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ
لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ

طیور آشیانے سے جانے لگے
وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے

سُن آواز شیرانِ نر ڈر گئے
پلنگ و تمر[1] خوف سے مر گئے

جہاں تک نظر آیا صید تھا
بیاباں اسی پہن[2] سے قید تھا

گئے مست ہاتھی مکانوں کو چھوڑ
دیئے پنجۂ شیر نیلوں سے توڑ

نہ دیکھا نہ ہم نے سُنا یہ شکار
کہ بکری سا ہاتھی کو لیتے ہیں مار

پلنگانِ صحرا کے دل خوں کیے
نہنگانِ دریا ہوئے مرچیے

ہوئے لشکری جبکہ سرگرمِ گشت
مقید ہوئے مست فیلانِ دشت

گئے جانور دشت خالی رہے
بیاباں میں جھاڑے گئے تو کہے

عجب تر ہے یہ صید کرنے کا ڈھنگ
کہ چو رنگ ہاتھی ہوئے بے درنگ

نہ چیتا نہ پاڑا نہ ارنا نہ شیر
ہوئے گولیاں کھا کے یک لخت ڈھیر

درندوں کا پیدا نہ نام و نشاں
نہ شیر ژیان و نہ پیلِ دماں

گوزن اور ہرنوں کی کیا دیجیے شرح
گئے شیر مارے سو کتوں کی طرح

گیا وحشت دروشت شورِ شکار
ہوئے گرگ آہو کے اوپر سوار

ہرن چکتیوں میں رہے گھومتے
کھپے فیل بیلوں ہی میں جھومتے

برابر رہے گور و شیرِ ژیاں
برابر تھا دونوں کو وسواسِ جاں

گئے بیشتر چھوڑ نخچیر گہ
شغالوں کی روباہ بازی تھی یہ

[1] ایک قسم کا چیتا [2] جنگل کی وسعت یعنی شکار اس سے باہر نہیں جا سکتا تھا

کروں صیدِ ماہی کا کیا میں بیاں | کہ فیلوں پہ تھے تودہ تودہ رواں
پڑے سیکڑوں دام تالاب میں | نہ چھوٹی تنک خاک اُس آب میں
نہ تیتر نہ طاؤس صحرا کے بیچ | نہ ماہی نہ مرغابی دریا کے بیچ
ہوا حائلِ راہ بحرِ عمیق | کہ ہو وہم ساحل پہ جس کے غریق
قریب آ کے اُتری پہ خائف تھی فوج | کہ بے ڈول اُٹھتی تھی ہر ایک موج
مہیب اور آلودۂ خاک آب | بعینہ پھٹی آنکھ تھا ہر حباب
عجب لجہ خیزی بلا جوش پر | طلاطم قیامت لیئے دوش پر
چلے بس تو کچھ کوئی چارہ کرے | مگر دیکھ ہی کر کنارہ کرے
تردد میں ہر اک کہ ہوں کیونکہ پار | کنارے پہ سرگشتہ گرداب وار
رواں آب ایسی روانی کے ساتھ | کہ جوں رفتگی ہو جوانی کے ساتھ
لگے پاؤں[1] چلنے جہاں شور تھا | کہ کم آب میں بھی بڑا زور تھا
نمک خوار مجھ سے تو ہوں گے ہزار | نہ میرا بھی ہونا ہے یاں یادگار
غرض میر تا دورِ چرخِ بلند | رہے آصف الدولہ اقبال مند
کرے اس کا اقبال ہر لحظہ کام | نگونسار اس کے دشمن رہیں صبح و شام

صید نامہ دوم

چلا پھر بھی نوابِ گردوں شکار | اسد باؤ کے گھوڑے پر ہو سوار
روانہ ہوئی فوج دریا مثال | نہنگوں کی اب کھینچی جائے گی کھال
گیا شور تا آسمانِ بریں | ہوئی گردِ افواجِ گردوں قریں
زمیں ہو گئی جائے خوف و خطر | فلک کو لگے دیکھنے شیر نر

[1] پاؤں اکھڑنے لگے۔

چڑھا بس کہ دریائے فوج گراں   اُتر ہاتھیوں کی گئیں مستیاں
دبے چپ لگا چلنے بھیڑوں کی چال   پریشاں ہے گرگِ بغل زن کا حال
پلنگوں نے کہسار سے راہ لی   نہنگوں نے دریا کی جا تھاہ لی
بگھیرے جو تھے دام سے چھا گئے   کشف[۵۰] نیچے ڈھالوں کے گھبرا گئے
درندے پرندے چرندے کھپے   گزندوں کے منھ گرد نیچے ڈھپے
تلف جانور ہیں جہاں کے تہاں   گوزن اور گورا اور آہو کہاں
رہے گور یک شاخ و یکسو غزال   تزلزل میں ہیں کیا شجر کیا نہال
شغال اور روباہ و خرگوش سے   نہیں بحث کچھ یہ ہیں بے ہوش سے
کوئی شورش سن کے گھبرائے ہے   کوئی کان ڈالے چلا جائے ہے
کوئی ڈھونڈھتا ہے بیاباں میں جھاڑ   کوئی چاہے ہے پھاند جاؤں پہاڑ
کہ شاید یہ اودھر ہو کل مکل   کوئی دن جیئے اس بلا سے نکل
پھرے مضطرب ہوکے شیرِ عریں   کہ بیشوں میں تھے یا کماں یا کمیں
اگر خرس تھا مفتر و بد معاش   لگا موش خانے کی کرنے تلاش
وگر ببر ہے پیش وپس ہے نگاہ   نہیں سوجھتی بے حواسی سے راہ
مبادا شکاری سگانِ رکاب   کریں آکے مجھ تک بھی پہنچیں شتاب
ہوا آب زہرہ وہ شیری گئی   جگر ڈر سے ہے خوں دلیری گئی
ہوئی صید بندی کی جنگل میں دھوم   گرے فیل جیسے گھٹا آوے جھوم
بیاباں میں چھایا ہے کیا ابرِ مرگ   برستی ہے گولی بسانِ تگرگ
نہ دل سرد ہے ببر و گرمِ شتاب   دلِ شیرِ برفی[۵۱] بھی ڈر سے ہے آب
ہوئی گرم آتش زنی سے ہوا   رکھا آب میں جاکے لگ لگنے پا
محیط آبگیروں[۵۲] کے تھے مردکار   ہوئے مالک[۵۳] الحزن چندیں ہزار

۵۰ کچھوے ۵۱ برف کے شیر جو بچے کھیل کے طور پر بناتے ہیں ۵۲ تالاب ۵۳ داروغۂ دوزخ

بہت دام پانی کی جانب کھچے — کھڑے رہ گئے رو و کیا کیا رکے

ٹھٹک سوس گھڑیال رہ رہ گئے — مگر کچھ نہ جانے کدھر بہہ گئے

نہ قُنقُل نہ سلّی[1] نہ سرخاب ہے — تمام اُن کے لوہو سے سرخ آب ہے

عجب روغنِ قاز ملتے تھے یار — کہ قازوں کو لیتے ہوا میں سے مار

منگاتے تھے بطخ کی چربی ظریف — سو وہ چربی اب پھینکدیں ہیں حریف

ہوئے کتنے اقسام ماہی شکار — نہ آوے قسم کھائے بن اعتبار

مگر مرگ ماہی تھے جالوں کے بیچ — کہ یوں مچھلیاں سب نکالیں اُلیچ

نہ ارنب[2] ہی جنگل میں نے سوسمار — کوئی بدّوی[3] کیا کھاوے پروردگار

کلنگوں کی اُلٹی گئی صف کی صف — ہوئی بیچ میں قرقری بھی تلف

نہ جیسے گئے سبزہ کھا کھا کے جیت — بٹیرے ویسے ہی آئے کھیتوں میں کھیت

بٹیر اور تیتر کا ہے کیا شمار — کہ باز آ گئے چرتے کرتے شکار

ہوا زرد سبزک بہت دل میں ڈر — نمد مو ہوا گرد سے شانہ سر[4]

خطرناک تھا دشت کیا کہیے مور — دبا یوں پھرے جیسے دبتا ہے چور

نہ پاڑھا نہ نیلا نہ چیتل کوئی — بنوں میں جو ڈون تھے گیا جل کوئی

کوئی میر صاحب غزالاں کہو — پر ایسی کہ ویسی کسی سے نہ ہو

نشیب و فرازِ بیاباں کو سُن — جو ذی ہوش ہیں وے تو ہوتے ہیں سُن

چڑھو آسماں پر جو ہووے چڑھاؤ — پھر اترو تو تحت الثریٰ ہی کو جاؤ

جو اس میں کہیں ہووے لغزش تو خیر — کہ در پیش ہے اور عالم کی سیر

زمیں ضیق از بس ہوئی یک بیک — نہ پھیلا سکا پاؤں گرنا[5] تنک

ملے پر سے پر تھے ہوا پر کلنگ — کہ چلنے لگے یاں سے تیر و تفنگ

نہ پر تھا نہ پرزا نہ بازو نہ پا — کنھوں نے بھی پوچھا نہ یوں تھا یہ کیا

---

[1] مرغابی [2] خرگوش [3] جنگل میں رہنے والا [4] ہُدہُد ایسے تھے جیسے کوئی جل گیا ہو [5] سارس

نہ ۔ردی کو دیکھا نہ پایا کبود — نکالا ہے لوگوں نے پانی بہے وو
تو آگے بیابانِ پُر خار ہے — کہیں جھاڑ بوٹا کہیں خار ہے
بیابان وحشت اثر پُرخطر — یہی ڈر ہے ڈر کیا ادھر کیا اُدھر
جہاں تک نظر جائے سوکھی ہے کانس — اگر سبزہ تھا بھی تو تھوہڑ کا بانس
کہیں دل رُکے بند ہو جائے دم — لکھوں کیا نیستاں ہی تھی یک قلم
چلے باد دن کو تو ہو سائیں سائیں — پڑے رات تو پھرکے بھائیں بھائیں
نہ سبزہ نہ کھیتی نہ آبِ رواں — کوئی شیرِ غرّاں کہ ہیں دماں
سو وہ شیر مارا گیا مثلِ سگ — وہ ہاتھی پکڑ لائے بے تاز و تگ
کوئی دشت ایسا کہ تھا سبزہ زار — ہوا دلکش و جرگہ جرگہ شکار
اگر آہو گیری کا ہوتا نہ عیب — تو وہ ہم بھی رکھ لیتے بشتاب و بیب
مسطح زمیں میل در میل تھی — نہ دریا چہ تھا کوئی نہ جھیل تھی
ہوا اک جبل سامنے سے سیاہ — اسی کی طرف کو پڑی سب کی راہ
عجب لطف کا تھا وہ کوہِ گراں — کہ صد چشمہ کا اس میں پانی رواں
شجر سبز و پتھر بہت صاف تھے — سبھی جیسے الماس شفاف تھے
ہوا ایک ابر اُس جبل سے بلند — ہوا پر بچھے اُن کی ہرڈوی[1] پرند
پہر دن سے بارش لگی ہونے زور — رہا ساری وہ رات طوفاں کا شور
ہوئے خیمے پانی کے اوپر حباب — سب اسباب لوگوں کا تھا زیرِ آب
نہ پوچھ اور اسبابِ مردم کا حال — نہ چادر رہی خشک نے کوئی بال
قنات اور تنبو بسر سب گئے — کھڑے تھے جو کنارے لے اُتر سب گئے
بھرا پانی لشکر میں پھیلا ہوا — اگر فرش بستر تھا پھیلا ہوا
ہوا سرد از بس ہوئی ایک بار — کلیجوں کے ہوتی تھی برچھی سی پار

[1] چھپانے والے۔

پھرے باد سے لوگ منھ ڈھانپتے — جگر چھاتیوں میں ہے کانپتے
رہا ایسی سردی میں کیدھر شکار — ہوئے لوگ خیموں کے اندر شکار
بہت پیر جب جی کو تجنے لگے — جوانوں کے بھی دانت بجنے لگے
تہ میغ خورشید پنہاں ہوا — ندیکھا مگر روئے جاناں ہوا
ہوا پر جو تھے مرغ پرواز میں — گرے سیکڑوں ایک آواز میں
بہت جانور کھا گئے کر کباب — ہوئے آشیانے ہزاروں خراب
برس مینہ دو دن میں کھل بھی گیا — ولیکن ہی کہرا لطیف نیا
کہ اندھیر تھا جیسے ظاہر ہو دود — ہوئے ہو نٹھ سردی سے سب کے کبود
بلا دھوم سے کوئی گھبرا پڑے — جنھیں دیکھو وے کانپتے ہیں کھڑے
یہی چال تھی ایک دو چار کوس — ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی پڑی ایسی اوس
بلندی تھی اس کوہ کی تا فلک — نگہ جاتے ہی جاتے جاتی تھی تھک
نہ اس رنگ سے صید ہوں گے کہیں — ہوئی خون کے رنگ رنگیں زمیں
ہوا ایک جنگل میں آکر گزر — کسو کو نہ تھی واں کسو کی خبر
تراکم[1] قیامت تھا اشجار کا — ستم پھر ہوا ہی ستمگار کا
کہ اس مرتبے بار و سرد تھے — ہوئے سُن مگر برف پرورد تھے
کوئی خار بن حائل رہ ہوا — پھٹے پیرہن ہوش سب نہ ہوا
درختان بے برگ و بر بدنما — نہ اک شاخ پر مرغِ رنگیں نوا
بہت سر ملائے بہم تھے شجر — ولیکن نہ پایا کنھوں نے ثمر
نہ قمری ہوئی نالہ پرداز ٹک — نہ بلبل کی واں آئی آواز ٹک
یہی کل مکل تھی یہی کشمکش — پھرے مارتے سر کو دیوانہ وش
نکلنا ہوا کھینچ کر یہ عذاب — ملا بیشتر ایک تہ دار آب

[1] گنجانی. گھٹا ہوا.

رواں تھا کسو کی طرف تند و تیز
ہوا اس کے چلنے کی تھی پیش خیز

حباب اس کا چشمک زناں موج پر
کہ یوں گرم جاتے ہیں اہلِ نظر

پہاڑی کہ تودا کہوں خاک کا
کہ انبار تھا خار و خاشاک کا

محاذی تھا اس کوہ کے ایک دشت
کہ دشوار تھا اس میں آدم گشت

ہوا ابر بہت اور پانی لگے
قدم راہ چلتے ہوئے ڈگمگے

چلے پاؤ تو اک موحش ہو شور
رکھے پاؤں دامن کو کھینچے بزور

فقط خارِ بن کیا کپٹر بچھاڑ تھا
کہ بوٹا بھی واں جھاڑ جھنکاڑ تھا

چلو سے چاہیے پہ چلتے نہیں
کہ اشجار آگے سے ٹلتے نہیں

نہ ٹوٹیں نہ سرکیں نہ کاٹے کٹیں
مگر پچھلے پاؤں ہی رہرو ہٹیں

کہیں ہاتھی آیا ہی بھڑکا ہی اونٹ
کھڑے لوگ پیتے ہیں لوہو کے گھونٹ

کہیں ہیں گے انفار سرگرمِ جنگ
کرے ٹٹو پر دل کا عرصہ ہیں تنگ

قیامت نمودار ہر ہر قدم
چلے کوئی کیا رکھ کے سر پر قدم

کہیں بچ کے نکلے کہیں جھاب چلے
کہیں مضطرب تھے کہیں رک چلے

کہیں بید کے برگِ خنجر گزار
کہیں پا نہ رکھنے دیں سر تیز خار

اگر بید آئے تو بن بید باف
نہ آئے نظر دور تک راہ صاف

اگر یا لس تھے واں تو تھے دشت دشت
کہ دشوار تھا دو قدم کا بھی گشت

رہا ہر قدم گرنے ہی کا خطر
چلے دو قدم راہ پائی اگر

بہت لوگ دشتِ قلم کو گئے
بہت اسپ و اشتر عدم کو گئے

شجر سرکشیدہ بہت۔ کیا کہوں
جو دیکھوں تو پگڑی سنبھالے رہوں

نہ سبزہ کہیں تھا نہ آبِ رواں
نہ دامن میں اس کے چکارا دواں

دکھائی نہ دیتا تھا خوش قد نہال
سیاہی پکڑتے تھے چشمِ غزال

نہ پھولی تھی سرسوں نہ کچھ تھی بہار — نہ ظاہر ہیں اس کے کہیں لالہ زار
نہ چہنک زناں دور و نزدیک پھول — نہ نرمی سے آتی تھی بادِ قبول
چلے باد ایسے کہ جھکڑ رہے — ہوا اور پانی میں پھکڑ رہے
اُدھر باد کا شور ادھر آب کا — شب و روز مذکور کیا خواب کا
ادھر کے تئیں ایک تھا آب شار — وہ البتہ شایانِ سیر و شکار
وہیں ایک دم تھا دلوں کا لگاؤ — اُڑانے نہ دے جو حواسوں کو باؤ
سوا اپنے تئیں تو نہ تھا کچھ دماغ — کہ حال اپنا تھا جیسا بجھتا چراغ
بہت شعبۂ کوہ مشہور تھا — زبانوں پہ لوگوں کی مذکور تھا
رواں دو طرف اس کے اک آبِ کم — کہ دل کا لیے جائے سب تابِ غم
جہاں تک نظر کیجئے ۔ مد نظر — ہوا موج زن کوہ کے تا کمر
نظر والوں کے جی بھی ڈھلنے لگے — گرفتہ دل اس جائے کھلنے لگے
وہ پانی چلا واں سے دریا ہوا — رواں گرم تر سوئے صحرا ہوا
بہا دامنِ کوہ میں سنگ پر — کیا سنگ ریزوں کو بھی تاب پر
کہ لوگ ان کو ہاتھوں میں کھنے لگے — جواہر کے رنگوں پر کھنے لگے
کراڑوں کا کیا عظم کیجے بیاں — برابر کھڑے تھے وہ کوہِ گراں
انھیں میں سے تھی راہ اس آب کی — وہیں بھیڑ رہتی تھی احباب کی
غرض ہو وزیرِ جہاں ارجمند — رئیس کلاں کار عالم پسند
در اس کا ہو بابِ سجودِ سلاں — رہیں حکم کش اس کے زور آوراں
صدا وہ رہے یوں ہی دشمن شکار — جہاں میں سخن ہو مرا یادگار

لہ بلند کنارہ ۔

صید نامہ سوم

مکرر ہی نواب کو قصدِ صید
بیابانِ پہنا[1] ور اب ہوں گے قید[2]

رواں بحرِ لشکر ہوا موج موج
گئی چشمِ خورشید تک گردِ فوج

بحار و صحاری پہ ہی عرصہ تنگ[3]
نگہ بان سراسیمہ ہیں واں پلنگ

پہن بیٹھے ہیں شیر شیری[4] لباس
کریں لوگ شاید فقیری کا پاس

چکارے ہرن دونوں اندیشہ مند
دلوں میں ہراسِ کمان و کمند

کہیں گرگِ وادی کو فکر گریز
نظر ادھر اودھر کرے شیر تیز

بنوں میں ہی آشوب کو ہوں پٹی
بیابان وطن سارے گرمِ سفر

اسد کی نہ شیرانہ ہنکار رہی
نہ کفتار کو تابِ رفتار رہی[5]

جہاں کے تہاں فکر میں ہیں کھڑے
کہ دنگل میں جنگل میں کہاں پڑے

وحوشِ بیاباں کو وحشت غضب
ہوا میں کھڑکتے ہی پتے کہ سب

ہزاروں ہی بندوق ہر دم چلے
ہوا ہی میں پیچھے پکھیرو سے چلے

شتر مرغ سیمرغ از بس ہراس
نہیں آتے کوہ شمالی کے پاس

اٹھا فوج میں سے یہ گرد و غبار
کہ منہ پر تھا خورشید آئینہ دار[6]

فلک کہرے سے تھا دھواں سا نمود
سماں شب کا رکھتا تھا ملکِ شہود

زمیں تھی سو تھی فرش بالائے آب
تخلخل سے مطلق نہ گھٹتی تھی تاب

نہ پوچھو کہ لوگوں کا کیا حال تھا
جو رکھیے قدم واں تو بھونچال تھا

کیے گم جو گینڈے نے اپنے حواس
کھڑا ہو رہا آکے بھینسوں کے پاس

کہ بھینس اس کو بھی جان کر لشکری
چلے جائیں صرصر نمط سرسری

کہیں جی اٹھی تھی زمین بعدِ مرگ
نہال اس کے خوش قد و بسیار برگ

[1] کشادہ در جس کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ [2] ہونگے قید۔ گھیرے جائیں گے۔ [4] شیر کی کھال کا لباس جو فقیر پہنتے ہیں [6] آئینہ دار: آئینہ جو کنگھے کو ملا لیتا ہے۔

نہ بستی سے صحرا تلک سبز تھے
نظر جائے جس جا تلک سبز تھے

ہوا دلکش و ہر طرف سبزہ زار
کہ ہر سوں نے کی تھی قیامت بہار

کسو ایسے جنگل میں جانا ہوا
کہ مشکل قدم کا اُٹھانا ہوا

چلی ہر طرف اب جو آکر تفنگ
نہ اوقات صلح و نہ ہنگام جنگ

لگی آگ جنگل میں چارا گیا
بن آئی نہ کچھ مفت مارا گیا

ہوا[51] چہرہ کوئی تو جوں شیر سنگ
نہ شیری دلیری نہ چہرے پہ رنگ

تحمل ہو کچھ بھی تو تدبیر ہے
کریں کیا اگر یوں ہی تقدیر ہے

کہیں دون گئی ہے تمامی ہی دود
کہیں وہ شجر ہیں سو کیا بد نمود

نہ پتا نہ شاخیں نہ کچھ ان کو بار
سراپا ہی خشک و زبون و نزار

نہ سائے سے ان کے کوئی بہرہ مند
نہ دیکھا چرندہ نہ آیا پرند

کشیدہ قد اس بن کے سارے درخت
چمن کے سے تھے تو بادگان بدبخت

برابر برابر کھڑے سر بسر
پھرے دیر اودھر کو جا کر نظر

پرے چل کے آیا تراکم[52] بہت
تو اس اس میں جا کر ہوئے گم بہت

کہیں راہ نکلی تو چلتے پڑے
رہے پال و پر تل بہت ڈال کھڑے

کہ شاخوں نے جھک جھکا ملائے تھے سر
بہت آگے جا جا کے آئے تھے پھر

وہی راہ درپیش و کثرت ہوئی
قیامت کے اوپر قیامت ہوئی

عجب راہ پُر خوف مشکل گزار
نہ ہوتے تھے معلوم ہاتھی سوار

خطر شیر کا شور ہنگامہ[53] کا
عجب واں کے جانے کا غم راہ کا

کہ جاؤ زمیں کچھ ہویدا نہ تھی
کہیں اُس میں پگڈنڈی پیدا نہ تھی

گڑھے خار پاؤں کی لغزش بلا
چلی پاؤ ٹوٹنے[54] کی لرزش بلا

صدا برگ نے کی نہایت مہیب
طریق[55] عجیب و مسافر غریب

۵۱ مقابل ہوا۔ ۵۲ گنجانی۔ گھنا ہونا۔ ۵۳ راہ کا خطرہ پیچان ہے۔ ۵۴ نل۔ نرکل۔ ۵۵ راہ۔ راستہ

جنوں پیشہ وہ دشتِ وحشت شعار | کہ قبل اس کے طفلانِ بازی مدار
کہیں پانی آیا سو حالت خراب | کہ تھا نہ بہ سکا وہ اس میں ہرجائے آب
چلے صبح کو دامنِ کوہ کو | تماشا کناں فوج و انبوہ کو
درختوں میں چلنا تو دشوار تھا | ولے راستہ بھی قدم دار تھا
گزار ہوا یو نہیں اک آدھ کوس | پٹیلے پہ ہنگامہ آرا تھی اوس
نیستاں میں چھپتا تھا گھوڑے سوار | اگر ہو تو واں شیر کا ہو شکار
نہ رہتے تھے سو شیر نر زہ بھی واں | نہ ہاتھی کے پاؤں کا پایا نشاں
عجب کشمکش درمیاں آگئی | بھڑ اک بلا تھی جہاں آگئی
نہ ملنے کو جا گہ نہ چلنے کو راہ | سروں پر کھڑے ہیں وفیلِ سیاہ
بہا سنگ ریزوں پر اس رنگ آب | کہ قدر ان کی جوں قدر یاقوتِ ناب
لیئے عہد ہاتھوں میں تھیں بہار | کہ ہر شے کا ہے وقت لیل و نہار
اسی آب کا راتی یاں ہے نام | ہمیں ساتھ اس کے ہے ربطِ تمام
کنارے کنارے اسی کے ہے راہ | چلے جاتے ہیں گو نہ ہووے پناہ
جبل سے ہوئے ظاہر آثارِ آب | برسنے لگا قطرہ قطرہ سحاب
شکار افگناں راہ کرتے تھے طے | ملے جاتے تھے خاک میں دشتِ نے
بڑے جانور خوار کیا کیا ہوئے | بندھے پائے فیلاں سے رسوا ہوئے
بہت نالے کھولے پھاڑے گئے | بچیروں سے رہ ہو نکالے گئے
مگر کی پس از مرگ عزت ہوئی | کہ ہاتھی پہ چڑھنے کی فرصت ہوئی
کشف کا ہوا ہے یہ اوصاف اب | کہ جھینگوں نے کی سرخ کشاف آب
وگرنہ بشر کا نہ مقدور تھا | قریب اس کے جانا بہت دور تھا
بحیرہ نہ دریائے اعظم سے کم | اٹھا کرتے تھے لجے لطمی ۴۰

ہر اک موج اس کی سمندر کی لہر　　کنارے پہ گرداب غرقاب قہر
یہی جنگل اس جھیل کے آس پاس　　درختوں کا انبوہ نے کا اکاس
اسی بن میں شیر اور یوزہ پلنگ　　اسی بن میں گور و گوزن[۵۰] اورنگ[۵۱]
اسی بن میں ہاتھی وہیں کرگدن　　وہیں فوج سرزن اسی میں ہرن
اسی بن میں لنگور بندر بھی تھے　　وہیں ایک دو ہم قلندر بھی تھے
اسی بن میں پاڑھا وہیں نیل گاؤ　　اسی بن میں پہ صید بندی کا چاؤ
اسی بن میں تھے حضرت جمشید[۵۲]　　اسی بن میں نسناس[۵۳] ان کے مرید
اسی بن میں تھے خوک جا ہوش رنگ　　کیا اس سوئر بن نے لوگوں کو تنگ
اسی بن میں رہنا اسی بن میں راہ　　وہیں شام کا حسن و لطف نگاہ
اسی بن میں وہ جھیل گہری بہت　　ہوئے صید بری و بحری بہت
وہیں مچھلی کھیتی تھی دمڑی کی سیر　　ولیکن نہ کھاتا تھا ہو کوئی سیر
کہ اس آب کا ہضم دشوار تھا　　کہ جوں آب شمشیر دم دار تھا
شغال اور خرگوش بے جیسے گئے　　شکاری سگ ان کو چبا لے گئے
کنارے پہ تھی اس کی یک گل زمیں　　سراسر ہری جوں زمرد نگیں
جہاں تک نظر جائے شاداب تھی　　کہ یک دست واقع لب آب تھی
نواڑوں[۵۴] کی سیر اس میں ہر شام گہ　　وہی سیرگاہ و وہی دام گہ
عجب ڈھب سے کی روشنی صد عجب　　کہ دیں چھوڑ نا دیں وہیں بھر کے سب
جدا ہو دیں تو غنچہ غنچہ چراغ　　ملے جیسے عاشق کی چھاتی کے داغ
ورے روشنی شعلہ انگیز نار　　پرے سطح پانی کی آئینہ وار
ہوئیں کشتیاں کچھ ورے سے پرے　　چراغوں سے موجوں کے کوچے بھرے
حبابوں میں تھی جو چراغوں کی تاب　　حبابی تھا آئینہ سب سطح آب

---

۵۰ پہاڑی بکرا یا جنگلی بیل　۵۱ (کسی مخصوص نام کی وجہ سے خاص اصطلاح)　۵۲ ایک جانور نصف بشکل انسان　۵۳ ناؤ جو صرف دریا میں سیر کرنے

نمودارِ چرخ پر انجم تھی شب / دلوں سے وہ پھیلاؤ پانی کا سب

غرض روشنی کی عجب کچھ تھی لاگ / لگا دے ہے گویا کہ پانی میں آگ

زمانے میں ہے رسم کہنے کی کچھ / اُمید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ

کسو سے ہوئی شاہ نامے کی فکر / کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر

گیا شاہجہاں نامہ کہکر کلیم / دلِ شاعراں رشک سے ہے دو نیم

کنھوں نے کہی عشق کی داستاں / ہوا کوئی کھانے سے ہمداستاں

پئے آصف الدولہ میں نے بھی میر / کہے صید نامے بہت بے نظیر

نگہ نام نامی یہ مشہور ہو / گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو

زہے آصف الدولہ داد گر / سخنور نواز اور عاشق ہنر

وہش سے جہاں اس کی ذوق پذیر / وزیر ابنِ دستور ابنِ وزیر

کریمی کرے تو جہاں در جہاں / کفِ جود خورشید سا زر فشاں

سراپائے احساں تمامی ہمم / ہمہ تن مروت سراسر کرم

ہمیشہ رہے گرم سیر و شکار / یہ حرف و حکایت بھی ہے یادگار

اژدر نامہ

(۱۹)

جس میں میر صاحب نے اپنے آپ کو اژدہا اور اپنے حریفوں کو کیڑے مکوڑے ظاہر کیا ہے

یہ موذی کئی ناخبردارِ فن — نئی ناگنیں جن کے ٹیکوں پہ پھن[۵۱]

نہیں جانتیں ہوں میں مارِ سیاہ — زبانہ[۵۲] ہے آتش کا میری نگاہ

نفس ہے میرا افعیِ پیچدار — گیا جس سے خصم قوی من کو مار

جدھر بھر نظر دیکھوں لگ جائے آگ — دمِ دم کشی لب پہ پھیلیں ہیں ناگ

جہاں میں ہوں وہ جا ہے پر شر و شور — عصا سے چلے راہ واں مار و مور

مری آنکھ سے زہر ٹپکا کیا — جلا آگے میرے بھبھوکا دیا

حکایت بعینہ یہ دل سے ہے میر — سرِ راہ کہتا تھا جو اک فقیر

کہ تھا دشت میں ایک اژدر مقیم — درندوں کے بھی اس سے دل تھے دونیم

نکلتے نہ تھے اس طرف ہو کے شیر — پلنگ و تیندوے[۵۳] واں نہ ہوتے تھے دیر

جہاں شیر کا زہرہ ہوتا ہو آب — شغال اور روبہ کا واں کیا حساب

وہ صحرا تھا اس کے سبب ہولناک — دمِ اس کے نے واں کی اڑا دی تھی خاک

نکلتا تھا جب بہرِ برگ و نوا — شجر کے شجر ہوتے تھے تب ہوا

کہاں سایہ اس جا وہ سبزہ کہاں — درخت اس کے چاٹے ہوئے تھے واں

صدا جب مہیب اس کی ہوتی بلند — جگر چاک کرتے ہوا سے پرند

درندوں کے بر جا نہ رہتے حواس — چرندے مکانوں سے ہوتے اداس

وحوش اس بیاباں میں جاتے نہ تھے — طیور آشیانوں میں آتے نہ تھے

کبھو اس کی رہ میں جو اٹھتا غبار — تو وہ دشت تھا ایک تاریک غار

---

۵۱ یہ ناگنیں جو میری حریف ہیں یہ نہیں جانتیں ۵۲ شعلہ ۔ ۵۳ ایک قسم کا چیتا

پہونچتا تھا گردوں تلک شور و شر ہوا صاف ہوتی نہ دو دو پہر

رہا کرتی کوسوں تلک اُس کی دھوم نہ اُس راہ آتا کوئی جز سموم

پراگندگی تھی اس انبوہ میں کہ گونجی بلائے سیہ کوہ میں

اس آواز سے جی نکل ہی گئے جو ثابت قدم تھے بچل ہی گئے

سیہ جب ہوا ہو گئے منھ سفید ہوئے مدعی جان سے نا اُمید

مری ان گزندوں کی صحبت ہی یہ طرف ہوں مری ان کی طاقت ہی یہ

جو مجھ کو ہو کچھ بھی انھوں کا خیال تو یہ مارگیری کریں کیا مجال

تو کیا ہوا انھوں سے بہت دور ہیں ہوں اپنی جگہ شاد و مسرور میں

مری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے جو رتبہ ہی میرا مرے ساتھ ہے

کہاں پہونچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

تنبیہ الجہال

(۲۰)

صحبتیں جب تھیں تو یہ فنِّ شریف — کسب کرتے جن کی طبعیں تھیں لطیف
تھے ممیز درمیاں انصاف تھا — خار و خس سے کیا یہ عرصہ صاف تھا
دخل اس فن میں نہ تھا اجلاف کو — کچھ بتاتے تھے یہ سو اشراف کو
تھے جو اس ایام میں اُستادِ فن — ناکسوں سے وے نکرتے تھے سخن
پھر حصول اس سے نہ دنیا ہو نہ دیں — کوئی حاجت اس سے وابستہ نہیں
گر چمار اس کارخانے میں نہ ہو — ٹوٹے جوتے کو کہاں لیکر پھرو
چار نا چار اُس کنے جانا پڑے — کوڑیاں دے جوتی گٹھوانا پڑے
حاجت اس فقرے سے مطلق یاں نہیں — جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصاں نہیں
یہ تو دُنیا میں ہی اس فن کو کمال — دین کا اس فرقے کے پوچھو نہ حال
کذب ہو جس جائے رونق بخشِ شمع — واں کی دینداری[1] نہ تھے اور دل کو جمع
جھوٹ آوے اس قدر جب درمیاں — کیا یقیں۔ ایمان کیسا۔ دیں کہاں
ہم تلک تھی بھی وہی رسمِ قدیم — یعنی جن کے ہوتے تھے ذہنِ سلیم
پیار کرتے تھے انھیں اُستادِ فن — ان کے ہوتے رہنمیر راہِ سخن
جلف واں زنہار پاتے تھے نہ بار — شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار
نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا — شعر سے بزازوں نداقوں کو کیا
الغرض یاروں نے قینیں دیں اُٹھا — جو کوئی آیا اسے دی پاس جا
ٹک نہ استعداد سے کی گفتگو — کچھ نہ رکھی شاعری کی آبرو
چار سکھیاں[2] کہہ کے دیں ناکس کے ہاتھ — پھر اسے مجلس میں لائے اپنے ساتھ

[1] واں کی دینداری سے جمعیت خاطر نہیں ہو سکتی۔ [2] پہیلی۔ کہہ مکرنی۔ (مراد ادنے درجہ کی شاعری ہے)

آپ بیٹھے صدر میں وہ دستِ چپ | کرنے لاگے شاعری سے حرف و گپ
بولے ان کو آج کل سے ہے خیال | ذہن اُن کا تیزی رکھتا ہے کمال
ہو رہیں گے کچھ اگر صحبت رہی | اور ہم سے بھی انھیں الفت رہی
جب ہوا ثابت وہ اُن کا مستفید | سب نے جانا اس کو شاگردِ رشید
کی اشارت تا کہ وہ کھولے دہن | آگے اُستادوں کے ہو گرمِ سخن
ان کے ایما سے وہ کچھ پڑھنے لگا | صاحبانِ فن کے منہ چڑھنے لگا
نیم قد اُٹھ اٹھ کے بھی سُننے لگے | جا و بے جا سر کے تیئں دُھننے لگے
وہ سراپا جہل ناگہ وقتِ کار | ہم سے تم سے کرنے لاگا اعتذار
سر میں رکھ کر دعویِ طبعِ لطیف | میر و مرزا کا ہوا آخر حریف
کیسی کیسی یوں گئیں طبعیں بباد | آفریں شاگرد و رحمت اُستاد
جب تلک یاں تھی تمیزِ زشت و نیک | کا ہے کو یوں شعر کہتا تھا ہر ایک
اہل فن کی رہتی تھی سب کو تلاش | ان کے ہاں کرتے تھے جا کر بود و باش
جو کہ خود سر سیکھتے اُستادوں سے عار | ان کے تیئں ہرگز نہ ہوتا اعتبار
زندگی بلکہ انھوں پر شاق تھی | ہاتھ گر لگ جاتی تھی شلاق[1] تھی

حکایت

شائقِ فن تھا وزیرِ اصفہاں | ایک دن آیا ہلالی[2] اس کے ہاں
حاجبانِ در سے ہو آگاہِ کار | کی اشارت تا اسے دیں گھر میں بار
عزت و تعظیم کی حد سے زیاد | پاس لے مسند پہ بیٹھا شاد شاد
اُن نے کھینچی اس کی مرزائی بہت | بیٹھے بیٹھے رات جب آئی بہت
شعر کی تقریب لا کر درمیاں | کرنے لاگا شاعری کا امتحاں
شعر خوانی کی پڑھا سو تھا غلط | سُنتے ہی بھڑکا وہ شعلے کی نمط

[1] قمچی یا بید

غصے ہو بولا کہ ہاں فراش[۵۰] چوب[۵۱]　　　کھینچ لا[۵۲] میداں میں کی شلاق خوب

اس قدر مارا کہ بے دم ہو گیا　　　سوج دست و پا ہر اک تھم ہو گیا

کھینچ کر ڈلوا دیا دربار میں　　　یہ خبر پہونچی جو ہر بازار میں

وارث اُس کے لے گئے آرات کو　　　جب بخود[۵۳] آیا تو پایا بات کو

یعنی دستورِ زماں دشمن نہ تھا　　　یا وہ کچھ ناآشنائے فن نہ تھا

غالبًا پایا غلط اشعار کو　　　خوش نہ آیا اس کرم کردار کو

ورنہ شیوہ اس کا ہے لطف و کرم　　　جائزے ہیں دیے ہے دینار و درم

مجھ کو کیوں شلاق کرتا اتنی شب　　　کاہے کو بدنام ہوتا بے سبب

پس مجھے ہی تربیت اپنی ضرور　　　جا کے بیٹھوں اک سرآمد کے حضور

صحبت اکثر رکھوں اس اُستاد سے　　　شاید اس کی دولتِ ارشاد سے

پہنچے اک رتبے کو میری قیل و قال　　　ہو مجھے اس فن میں یا گنے نہ کمال

اُٹھ کے آیا مولوی حاجی کنے　　　مشق کی یک چند اس نامی کنے

جب ہوا کچھ شعر کا رتبہ بلند　　　اور مولانا لگے کرنے پسند

پھر گیا اک دن درِ دستور پر　　　حاجبِ درگاہ نے کی جا خبر

کاے امیر اس روز کا شلاق خوار　　　آج در او پر ہے پھر خواہانِ بار

کی اشارت سدِّ رہ کوئی نہ ہو　　　قصد ہے برخورد[۵۴] کا تو آنے دو

سامنے آیا تو کی نیچی نظر　　　دھوپ میں جلتا رہا وہ اک پہر

بعد ازاں ایمائے ابرو کی کہ ہاں　　　صحن ہی میں سے ہوا وہ مدح خواں

پھر وہیں سے دے صلا رخصت کیا　　　اک مصاحب نے جگر[۵۵] کر کر کہا

اگلی صحبت کی تھی عزت اس قدر　　　سو ہوئی شلاق[۵۶] حد سے بیشتر

اَبکی اس کو جائزہ دے کر گراں　　　تو نے فرمایا مرخص واں سے واں

۵۰ فراش یعنی ملازم ۔ ۵۱ چوب یعنی چھڑی، بید

۵۲ نوکر نے میدان میں لا کر خوب بید مارے ۔ ۵۳ حواس ٹھیک ہوئے ۔ ۵۴ فائدہ ۵۵ ہمت کرکے ۔ ۵۶ ترکی زبان میں بید مارنے کو

میں نہ سمجھا یہ کہ وہ کیا تھا یہ کیا — در جواب اس برگزیدہ نے کہا
ایسی ہی ہوتی ہیں تضحیک سلف — وحشت ہو تو ان کے تئیں کریے تلف
اس قدر اس کا تنبیہ تھا ضرور — تا کہ پہونچے یہ خبر نزدیک و دور
جو سُنے سو خودسری سے باز آئے — تربیت ہونے کو اُستادوں کی جائے
ورنہ کرتا پوچ گوئی ہر دبنگ — رفتہ رفتہ شاعری ہوجاتی ننگ
تب جو میں شلاق کی یہ خام تھا — اب جو آیا لایق انعام تھا
قصّہ کوتہ تھی تمیز درمیاں — ننگ ہے کرمِ[۲] مزابل پر بھی یاں
بے تمیزی سے ہے رائج ابتری — جس کو دیکھو خودنمائی خودسری
فی بیاں کا ہے سلیقہ نے زباں — اس پہ ہے ہر ایک سحبانِ بیاں
بس قلم وقتِ زباں بازی نہیں — چپ کہ دورانِ سخن سازی نہیں
کون حرفِ خوب کو کرتا ہے گوش — بات کی فہمید کا ہے کس کو ہوش
بے تمیزوں سے بھرا ہے سب جہاں — ہے دماغِ حرف ہم کو بھی کہاں

۱؎ قابو۔ اختیار

۲؎ غلاظت کے کیڑے

ہجو نااہل

(۲۱)

سنیو ای اہل سخن بعد از سلام
چھیڑتا ہے مجھکو اک تخم حرام

پر ہنسیں[1] مرغی کا گرم طیر ہے
وہم ہیں شہباز کا ہم سیر ہے

کام مجھ کو کچھ نہیں ہے اوس سے
بلکہ اس بھی طرز سے اُس طور سے

شاعری کو میری ہو گے جانتے
تم چنانچہ سب سمجھے ہو مانتے

میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار
کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار

گر کنھوں نے کچھ کہا میں چپ رہا
ہجو اس کی ہو گئی اس کا کہا

کیا ہوا گر چاند پہ پھینکیں ہیں خاک
پڑتی ہے ان سب کے منھ پر بیباک

رہیو شاہد کچھ نہیں میرا گناہ
مدعی بے ہیچ[2] ہے یہ روسیاہ

تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا
درد مند و عاشق و دلریش تھا

پر کروں کیا لاعلاجی سی ہے اب
غصے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تب

ایسے کتنے ہیں جواب شاعر بنے
مدتوں یہ لونڈے آئے مجھ کنے

ایک باتوں سے مری آدم ہوا
ایک نظر سے شہرۂ عالم ہوا

ایک نے دیوان کی میرے نقل لی
اس دوانے کی کنھوں نے عقل لی

ایک میرے طرز پر کہنے لگا
دوسرا پیرو مرا رہنے لگا

سارے عالم میں ہوں ہیں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

دور سے کرتا ہوں بیٹھا سب کی دید
کوئی سر کھینچو ہے میرا مستفید

کوئی ہو نہ کو نجانے میری قدر[3]
بائیں ہے بائیں آخر صدر صدر

ہے گی شخصیت خدا کی اور سے
ہاتھ کب آوے بزرگی زور سے

---

[1] بغیر پیروں کے [2] بے وجہ [3] کوئی ایسا نہیں جو میری انتہائی قدر نہ کرتا ہو۔

ایک کُنجڑا[1] ہے جو اک عمدہ کو ہوگ — تو اسے کیا کچھ طرف جانینگے لوگ
جو بڑے ہیں وے ہی آخر ہیں بڑے — ایسے کُتّے بہت پھرتے ہیں پڑے
شہر میں آیا ہیں بعد از بست سال — گم تھا یاں سررشتۂ قال و مقال
کسب جو کرتے تھے یہ فنِ شریف — ان میں سے کوئی نہ تھا میرا حریف
کتنے اک تو مشق تھے گرمِ سخن — سو بچارے آپ ہی ناآگاہِ فن
مدعی میرا ہوا یہ بے ہنر — مردۂ صد سال سے بے نور تر
کاسہ لیسِ مایۂ خبث و حسود — قلبۂ ذلہ روز سے بھی بد نمود
آتے اچھا ہے جو اس کو روکئے — ورنہ منھ دیکھو تو وہیں اوکئے[2] دو
ایک جا آیا شترِ بے گھر[3] گیا — واں شتر غمزہ سا مجھ سے کر گیا
رہ گیا میں پی کے لوہو کا سا گھونٹ — یعنی دیکھوں بیٹھے ہے کس کل یہ اونٹ
اس تحمل پر نہ کی مطلق نظر — خار پہلو کا ہوا ہر جا۔ پچر
جب لگا ہے ناچنے مستی سے خوب — تب لیا میں نے قلم کے زیر چوب
مستی اس کی ساری اب جھڑ جائے گی — دھوم ساری گلیوں میں پڑ جائے گی
جب بڑوں سے مار ناہموار کھائیں — کج خرامی سے تب اپنی باز آئیں
راہ سیدھا ہو کے چلتا ہے بلے — اونٹ جب آیا پہاڑوں کے تلے
اونٹ کی خلقت پہ ہے قدرت کو ناز — اس کی خلقت کم ہے کیا اے بے نیاز
اُس کو یاروں نے غرض کیا کیا کہا — لیک یہ خر نامشخص ہی رہا
بے سبب سرگرم کیں ہم سے ہوا — مستحقِ لعنتِ عالم سے ہوا
چل قلم اب ہے ارادہ جنگ کا — پاس کب تک کیجیے نام و ننگ کا
یاں زبردستوں کو دعویٰ کھا گیا — یہ چھپا رستم کہاں سے آگیا
تھا قیامت فہم کو دعوے بڑا — ہو کے تنکا سا پہاڑوں سے اڑا

[1] کس قسم کا۔ کس مد میں شامل [2] قے کردو [3] جس کا گھر نہ ہو

ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اُٹھائے
چیونٹی کا کیا جگر جو منھ پہ آئے

جنگ ہاتھی کی ہو گو اس کو ہوس
پر اسے ہے موت کا ریلا ہی بس

ایک دھکے میں کہاں وہ کامنی
پودنی کی سی ہے اس کی ضامنی

میں نے پاس اس کا کیا حد سے زیاد
پر کمی کرتا ہے یہ ابنِ زیاد

قبلہ کہتے کہتے حاجی ہو گیا
پاسِ ظاہر چھوڑ پاجی ہو گیا

رشک حسرت سے مری مرنے لگا
میری عزت کا حسد کرنے لگا

لگ گئی چپ اس کو میرے شور سے
یہ نہ سمجھا ہے خدا کی اور سے

یہ قبولِ خاطرِ لطفِ سخن
دے ہے کب سب کو خدائے ذوالمنن

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور
اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور

خصمی وہ کرے کہ ہو معقولِ خلق
نے انھوں سے جو کہ ہوں مقبولِ خلق

دشمنی تھی اس کو مجھ سے کیا ضرور
حیف ایسی عقل۔ لعنت یہ شعور

ہوں جو میں پرتو فگن تو ہے یہ کیا
خور کے آگے ذرہ کب ٹھہرا رہا

خونِ دل آشام ہیں جو صبح شام
وے بھی لیتے ہیں ادب سے میرا نام

یہ مری رہ کا نہ حائل ہو سکے
یہ موئی جوں کیا مقابل ہو سکے

میں نے اُلٹے اجگروں کی دم میں صف
ادھ موئی سی چھپکلی کیا ہو طرف

رکھتی ہے میری شرافت اشتہار
گو یا نا سید کہے ہے کیا؟ چمار

ہجو کی کیا اُن نے میں کیا دب گیا
بھونکنے پر سگ کے ہاتھی کب گیا

تنگ ہے میری توجہ اس طرف
حیف ہے میدانِ دریا سوئے کف

دار و دستی سے ہے اس کی مجھ کو شرم
تب تو باتیں ہیں گروں ہوں نرم نرم

ان عزیزوں کا نہایت پاس ہے
ورنہ یہ ملعون کیا کنّاس ہے

جو نہ سمجھا تیغ خامی ہی کے پاس
کاٹوں گا یوں جس طرح کٹتی ہے گھاس

جب سے لے آیا قدم اپنا یہ شوم — تب سے ویراں ہو گئی یہ مرز بوم

ایک بد یمنی ہی ہے کی بوم میں — لطف وہ پائے ہیں ہم اس شوم میں

دیدنی ہی قدرتِ ربِ ودود — ایسی اچرج کم ہی ہوتی ہی نمود

کیا کمی ہی یہ جو عزت کم کرے — گو نہ شیطاں سجدۂ آدم کرے

کرتی ہی تعظیم میری کائنات — لعنت اس پر ہوتی ہی دن اور رات

بیت کہنا چاہتا ہی شو ہنر — شاعری سمجھا تھا کیا خالا کا گھر

نامبارک ہی نہیں سادہ بھی ہی — اُلّو ہی اور اُلّو کی مادہ بھی ہی

عقل سے کس طرح ہووے بہرہ ور — ہی کسو حافظ کا نطفہ یا چہ خر

پر وہ حافظ جو ہو قرآں خوانِ قبر — اس سے لیں کار تلاوت کو بہ جبر

جھڑ گیا ہووے دماغ اس کا تمام — پڑھتے پڑھتے شور سے ہر صبح و شام

وہ خرفِ[1] جورو سے جا یک جا ہوا — ایسا اُلّو ناسزا پیدا ہوا

دیکھ کر ان کی خرامی پائے سرو[2] — ایک کوّے نے کی تقلیدِ تذرو

کود کر چلنے لگا آخر کو راہ — اپنی بھی رفتار بھولا رو سیاہ

کاشکے ہو وہیں محذر شیخ و شاب — چھوٹا سا منہ جو چکاسے[3] کا ہی باب

بد نمائی اس کی ہی بے ساختہ — کیا ہی یاں میشِ بچہ انداختہ

دیکھ اسے یاد آوے قدرت کاملہ — کیا بلا ہی مادہ خوکِ حاملہ

گرگ گردن، خوک جثہ غوک سر — غولِ صحرائی کا بچہ ہی مگر

چار سکھیاں کہہ کے شاعر ہو گیا — اس فنِ مشکل کا ماہر ہو گیا

باپ کو ان نے بنا رکھا ہی اُوت — ہیں کہاں ایسے سعادتمند پوت

کم ہوا ہی گا جو اس کا زورِ پا — جانتا ہی اس کو پیری کا عصا

کچھ نہیں معلوم اس کو سرِّ کار — تب تو ٹھہرایا ہی اس کو رازدار

[1] ٹلا ہوا بوڑھا [2] سرو کے نیچے [3] خارپشت، سیہی (جس کے بدن پر کانٹے ہوتے ہیں) سنگھ۔

تعریف آغا رشید خطاط

(۲۲)

میر خطاط یک قلم دیکھے — لیکن آغا سے لوگ کم دیکھے
یعنی عبدالرشید تھا اُستاد — خوشنویسی کی جن نے دی ہے داد
خط کی خوبی کا اس کی اب تک ڈھنگ — صفحۂ روزگار پر ہے رنگ
وہ تصرف کہیں جو کرتا ہے — شکلِ نقاش رنگ بھرتا ہے
حیرت افزا ہے حسن ہر تحریر — مشق اس کی ہے قطعۂ تصویر
خط شیریں جو اس کا پاتے ہیں — ہم حلاوت بہت اٹھاتے ہیں
لگ گئی ہے قلم تو جادو ہے — مد جہاں ہے کسو کی ابرو ہے
سطر لکھتا نہیں خفی کی دو — خط ہے خوباں کی پشت لب کا وہ[۱]
ایسا لکھنا کسو کی طاقت ہے — ہے جلی بھی تو ایک بابت[۲] ہے
خط میں کیسا ہی کوئی کامل ہو — اُس کا کب نقطۂ مقابل ہو
حرف کس کس ادا سے لکھتا ہے — کون ایسی صفا سے لکھتا ہے
ہے الف قامتِ نکورویاں — لام ہے زلف سلسلہ مویاں
دال کا خم رہے ہے ایسا خوب — جیسے جھکتے ہیں مست ہو محبوب
میم جس لطف سے لبالب ہے — دہنِ تنگِ مہوشاں کب ہے
ہے کشش خاستۂ[۳] تن خوباں — دائرہ دورِ دامنِ خوباں
دائرہ نون کا اس نمط کھینچا — کہ خطِ دلبراں پہ خط کھینچا
مدعی کو جو نسخہ دکھا دیں ہم — جیسے حرفِ غلط اُٹھا دیں ہم

۱؎ قابلیت ۲؎ جاہی۔ انگڑائی کے لیے بھی آتا ہے ۳؎ خاستن کی طرف اشارہ ہے۔ مگر آج کل مفہوم متغیر ہو گیا۔

مذمت آئینہ دار

(۲۳)

آج سے مجھ کو نہیں رنج و ملال
جب سے نکلے بال تب سے ہو یہ حال

مونگا فوں کا نہیں ہے نام اب
مدعی شعر ہیں حجام اب

ان سے کیں[1] ایک مو برابر بھی نہیں
جلف اشرافوں کے ہمسر بھی نہیں

پر ہوئے سر چڑھ کے یہ موئے دماغ
دود ہو جانے لگے سوئے دماغ

ہو گئے گرم سخن تب تو قلم
ورنہ یوں بیہودہ کب نکلا ہے دم

ایسے مونڈے میں نے کتنے بے شعور
ہے حجامت اس بھی فرقے کی ضرور

یاں نہ سید کچھ ہے ذونائی ہے شرط
ہو کسو کسوت میں دانائی ہے شرط

سگ کو نجم الدین کی سرداری ہوئی
نوح کے بیٹے کی وہ خواری ہوئی

میرو مرزا میں حکم ہووے خرد
ڈوم[2] کی نائے جن پہ سیدکا دست رد

سمجھے مرزا میر کو مرزا کو میر
ذو وہ رگ[3] زن جو نہ سمجھے شیر شیر

مجھ میں مرزا میں تفاوت ہے بہت
یاں تائی[4] داں عجالت ہے بہت

جس جگہ میں نے رکھی منھ میں زباں
ہوتے اس جاگہ جو مرزا سے گماں

اُسترے کانوں میں اپنے باندھکر
کب کے اب تک گھس گئے ہوتے ادھر

ان کمینوں کا گلہ کیا کیجیے
ایسے دش پیدا ہوں گر[5] نہ بیجیے

کہتے ہیں سرگرم بیباکی ہے یہ
ہوں تو ہوں ناپاک کیا پاکی ہے یہ

لکھیے اس فرقے کی اب تا چند ذم
خط بنادیں ایسا کریئے کف قلم

گرچہ ان کو کہتے ہیں آئینہ دار
لیک ان کا منھ نہ دیکھیں کاش یار

صاف قینچی پر اکیں چڑھو اسیے
گر[6] منڈ موا اس میں پھر ہو جائیے

[1] کینہ [2] نائے سے بانسری مطلب ہے کہ میر و مرزا لائق کی بانسری نہیں نہ بجے چاہے مشق کرے ان کے فیصلے کو عقل کی ...

چاہو ہو اس قوم کی کیا شرح حال　　آگے ہی آویں گے جلتے ہونگے بال

ایک[1] سفیدان کو نہیں چننے کی تاب　　ہوتے ہیں دشمن یہ کاٹے بال تک

کیا کہوں کیسے ہیں اوندھے یہ پچر　　کیجیے اصلاح عاید ہو وے شر

کھرچیں ایسا سر کہ کر دیں پائمال　　سیدھیاں جب سن لیں تب لیں الٹے بال

معتبر ان کے جو حجامی ہیں اب　　ہند میں وہ تیرہ روشامی ہیں اب

کوئی لے جائے جو حاجت غسل کی　　چُلّو چُلّو پانی پر دیتے ہیں جی

لعنتیں کرتے ہی گذرے اس کو واں　　غسل میں فرصت تشہد کی کہاں

بیٹھے جامہ[2] خانے میں کیا غسل کر　　جیب شاگردوں[3] نے واں رکھی کتر

لیک پھر اجرت کے اوپر جنگ ہے　　لات ہے گالی ہے پھر سر[4] چنگ ہے

اُس سقاوہ میں گیا تھا اک حریف　　اس کی فی الجملہ طبیعت تھی ظریف

دھو کے پاجامہ نہانے بھی گیا　　ایک طرف پھر پائخانے بھی گیا

غسل کے پیچھے جو منہ گھر کو کیا　　ہاتھ نائی کے سوا پیسا دیا

نائی نے پوچھا کہ پیسا یا ٹکا　　دمڑی یہ کیسی ہے میں قرباں گیا

ہنس کے بولا تو نہ بدلے[5] جائیو　　ہاں ٹکا بھی ہے اسے اُٹھوائیو

چوہرے نائی ہیں سارے ایک ذات　　ان میں ہے بدذات جو ہو نیک ذات

کاٹیے ان کے تئیں مثل گزر　　ہنڈے کے ہلکے ہیں اکثر پاچہ[6] خر

بعضے بعضے ان میں سے جرّاح ہیں　　بحر خون و ریم کے ملّاح ہیں

زر و زنگاری کئی ڈبے ہیں ساتھ　　حیض کے سے ایک ڈولتے ہیں ساتھ

موم ڈالیں تیل میں مرہم کریں　　پھر مسیحائی کا دم اس پر بھریں

پھیر بگڑے بیٹھیں ایسی شان سے　　آئے ہیں گویا ابھی ایران سے

باپ سے اپنے اگر پیسے نہ پائیں　　داغ کو اس کے جراحت کر دکھائیں

---

[1] صرف سفید بال ہی چننے کی کوشش نہیں کرتے [2] کپڑے پہننے کی جگہ [3] دھول دھپا [4] یہ بُری چیز تو خود نہ بیچا اس سو پیسے میں سے کسی کو اجرت دیکھ [5] اُٹھوانا [6] گدھے کا موت۔ پاچہ پیچا جامہ کا مخفف بنا لیا ہے۔

بعضے بعضے ان میں رعنا ہیں اگر
سو مشعلچی ہیں بھگت کے بیشتر

رنڈی گت ناچے یہ اُس کا منہ دکھائیں
پا بپا مشعل لیئے مجلس میں جائیں

روشنی لے دوڑتے ہیں وقت شام
گھورتے ہیں کر کے اندھیارا مدام

تیل کی کپّی لیئے خوش ہیں کھڑے
ایک بھڑوے ہوتے ہیں چکنے گھڑے

لاگ چلیں تو ہیں گے جیسے موچنے
کھائیں جب سر میں لگیں تب موچنے

چھیڑ لو تو مغز بھی لے جائیں یہ
سر کے تئیں سہلا کے بھیجا کھائیں یہ

بے حقیقت ہیں نہیں شایانِ کار
صحبت ان سے بگڑی ہو پایانِ کار

ایک کتے پالنے والے کی ہجو

(۲۴)

جو اک پھر کو رزق کی وسعت سی ہو گئی
تنگی کی حوصلے نے تو رجعت سی ہو گئی

کتوں کے ساتھ کھانے لگا۔ کتوں سے معاش
چھچھڑی[۱] کی طرح شام و سحر کتوں کی تلاش

پاکیزگی طبع و لطافت وہ بر طرف
کتا بغل میں مارے لگا پھرنے ہر طرف

ڈھکارو کتے کو تو لہو اپنا وہ پیئے
ہے اس کی استخواں شکنی کتوں کے لیے

یا چھوٹے ہاتھ کتے کو مارا نہ تھا کبھی
یا کتوں سے چٹاتا ہے اب اپنے منھ کو بھی

کتے ہیں پاس کتے ہیں جیب و کنار میں
کتے ہیں آستینوں میں کتے ازار میں

آیا جو ایک روز وہ بے تہ[۲] چلا ہوا
کتا ازار اس کی سے نکلا بندھا ہوا

یک سگ گزیدہ کی سی طرح جھومنے لگا
پھر کھول اس کے منھ کے تئیں چومنے لگا

ایسی بھی ہم نے دیکھی نہیں کتوں کی ہوس
گردن میں اپنی ڈالے پھرے روز و شب چرس[۳]

ٹکڑا ہو جس کے ہاتھ میں یہ اس کا یار ہے
جیسے سگ ہرزے سگ ہر سوار ہے

کتوں کی جستجو میں ہوا روڑا باٹ کا
دھوبی کا کتا ہے کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

تھکتا ہے پھر جو کرتے ہوئے دوڑا دھاڑ
لیتا ہے بے دماغ ہو لوگوں کے کپڑے پھاڑ

جو ہڈیوں پہ لڑتا رہا ہو بسانِ سگ
ہو آدمیت اس کو بھلا کس مقام تک

انساں کو انس کتے سے اتنا ہوا ہے کب
ناپاک اس کو جانے ہیں پاکیزہ لوگ سب

اصحاب کہف کا بھی جو سگ ہو تو ہے وہ سگ
نجم الدیں کے بھی کتے کو کتا کہے ہے جگ

کر سگ تخلص اپنا جو آیا بروئے کار
اکراہ سگ لونڈے[۴] سے کرنے لگا دیار

رہتے نہیں نفور تو سگبانِ بے شعور
کھاتے ہیں وہ بھی کتے ہیں کتے کو دور دور

کیا جانیے کہ یہ گُہِ سگ[۵] کیا متاع ہے
بازار میں جو دیکھے ہے سگ کو سماع[۶] ہے

۱؎ چھچھڑی ایک بے دار کپڑا جو کتوں وغیرہ کا بچھونا بنتا ہے ۲؎ بے محابا بے انتہا۔ ۳؎ چمڑے کا پٹا یا پھندا جس سے کتے باندھے جائیں۔ ۴؎ بد معاش جس کے کتے کا گوہ ہر چیز ہر قسم کا ہے ۶؎ وجد آ جاتا ہے۔

آدم گری اڑا رکھی۔ حرف و سخن گیا
دیکھا جو خوب تو سگِ دیوانہ بن گیا

دُم لابہ[1] جو دیے۔ تو لگے کرنے بدخصال
دوڑے وگرنہ کاٹنے کو کُتّے کی مثال

کم بخت یک غریب جو مردہ سا پائے یہ
مرگھٹ کے کُتّے کی طرح سے پھاڑ کھائے یہ

اور مدعی ہو تک بھی تو ہی دل قوی نصیب
پھر لگے اس کے سوکھی سی بلّی ہو یہ غریب

رہتا ہو سخت شیفتہ کتوں کے بال کا
پلّا یہ ہو کہے تو کسو کتّے وال کا

کتوں کی لیکے زرد و سیاہ و سفید چشم
کس کس طرح سے دیکھتا ہو داب اب چشم

کتوں کے شوق میں جو یہ آتش ہو زیر پا
کہتا ہو اس کو اب سگِ پا سوختہ بجا

اس کی پلیدی شہرۂ ہر شہر ہی رہی
کُتّے کے کاٹے کی سی اسے لہر ہی رہی

دلی میں تین کتیاں کہیں لیکے پالیاں
ہمسائیوں کی جنھوں کے لیئے کھائیں گالیاں

وے مرگئیں تو دیر رہا روتا غمزدہ
پستی[4] کے پیچھے پھر نہ ہنسا تک ستمزدہ

مونگی[3] کا گرم غم جو رہا سو کہ تنخ ہوا
برفی[5] کی تعزیت میں سگِ روئے تنخ ہوا

بلی جو پالتا تو بھلا ایک بات تھی
آئیں میں اس کی دوستی ایماں کے ساتھ تھی

توراں کے لوگ ہو ویں کہ ہوں اہل اصفہاں
کُتّا تو کشتنی ہو سب اسلامیوں کے یاں

جس کو خدا خراب کرے پھر وہ کیا کرے
کیونکہ زبان نکالے نہ جوں سگ پھرا کرے

آواز دے دے کتوں کو توڑے ہو اپنی جان
مرجائے گا یہ بھونکتے ہی بھونکتے نداں

ہو بس کہ سگ پرست مرے گا جو یہ دنی
توشے میں اس کے ہوگا نہ کچھ غیر سگ کنی

کتوں کے پیچھے پھرتا ہو گلیوں میں ڈور ہو
یہ سب ہو اس لیئے کہ ہر ایک جائے شور ہو

اس وضع ساختہ کے ہوں احمق فریفتہ
بہرہ ہو جن کو عقل سے وے کیوں ہو شیفتہ

ہو اس طرح کے معرکہ گیروں سے پُر جہاں
بہتیرے ایسے کتے نچاتے پھرے ہیں یاں

---

[1] دم ہلانا [2، 3، 4] کتیوں کے نام [5] وہ کتا جو برف پر پڑا ہو۔

بڑ پیٹا

(۲۵)

ایک پرخور آشنا ہے پیر
سینہ سوراخ جس سے ہے کف گیر

صد منی دیگ ہے شکم اس کا
نفس اژدہا ہے دم اس کا

آنت شیطان کی ہے اس کی آنت
دانت اس کا ہے ہاتھی کا سا دانت

خستۂ جوع وہ جو آئے نہار
منہ ہے گویا کہ زخم دامن دار

شکل مت پوچھ کھانے کا ہے ملی[۱]
منہ ہے چھینٹوں سے جیسے وٹی جلی

گال کلّے سے پھر توے سے سیاہ
کاسۂ سر ہے جیسے اوندھا کڑاہ

توند کالی جو کھول جاوے لیٹ
آہنیں ہے تنور اس کا پیٹ

راہ مطبخ میں پاوے ہے جو کبھی
چاٹ جاتا ہے دیگچے تک بھی

کھانا نکلے پر آوے ہے کیسے
چیل ٹوٹے ہے گوشت پر جیسے

وقت کھانے کے ہاتھ ہے اس کا
قاب پر نان پنجہ کش گویا

کیا وہ دو پیازہ کھاکے ہو تازہ
اک نوالا ہے قلیہ دو پیازہ

گوشت ہانڈی بھرا ہے خنک[۳] میں
ہنڈیاں گویا تھیں اس کی خشتک[۴] میں

خام طمعی سے اک کرے ہے آہ
دیکھ کر شب کو نان ہالہ ماہ

نہ ٹلے دیکھ کر وہ قاب پلاؤ
منہ منہ بیٹھا گرچہ کھاوے کھاؤ

کھانے پر جب وہ جی چلاتا ہے
لاٹھی پاٹھی بھی کھائے جاتا ہے

نہیں پہنچے جو کھانا کھانے لگ
ہڈیوں پر لڑے ہے جیسے سگ

بھوک کا باؤلا جو آتا ہے
لوگوں کو کاٹ کاٹ کھاتا ہے

دہموں[۵] میں دشمنوں سے بھی وہ لئیم
جائے گھل مل اگر سنے ہے حلیم

۱؎ مرد۔ بہادر ۲؎ چھپ کے ۳؎ اغوں سے ۳؎ ٹھوڑی کے نیچے کا مقام ضرورت شعری سے ن کو مشدد کرلیا ہے ۴؎ میانی، دمالی۔ ۵؎ عشرہ محرم میں دوسرے مذہب والے بھی شامل ہوجاتا ہے۔

آش بغرا[1] پہ مار بھی کھاوے — اس میں گو بوغرا[2] نکل جاوے

کسی مفلس کے گھر جو جاتا ہے — کچھ نہیں خفتیں ہی کھاتا ہے

بھوکھ سے جب کہ غصّے میں آوے — بزکوہی کی طرح جھنجلاوے

ہڈیوں کو نکہ[3] کے کھا جاوے — چنے لوہے کے بھی چبا جاوے

زہر کا جلنا آگ سے مانوں — بھوکھ اس کی چلے تو میں جانوں

نکلے بازار میں وہ جب بجریوز — سر ہی پھوڑے ہے دیکھ کر تربوز

گھاس پات اور کانس کھاتا ہے — بیٹنکر پر وہ بانس کھاتا ہے

اُس کے آنے کی سُن کے بازاری — کرتے ہیں سودوں کی خبرداری

کوئی تختہ کرے ہے دوکاں کو — کوئی لاوے بلا گزر باں کو

کنجڑے ڈھانکیں ہیں ساگ پات اپنا — تکے ہے بنیہ داؤ گھات اپنا

کہ مبادا ادھر کو آ جاوے — سووے یکسو ہمیں نہ کھا جاوے

اینٹ پتھر بھی کھا گزر جاوے — الغرض پیٹ اپنا بھر جاوے

پیٹ اپنا بڑا جو پاتا ہے — کوہ تک کا بھی حیف کھاتا ہے

وہ قضارا مرا ہوا مہمان — کھا گئی اس کی میزبانی جان

گھر میں جو کچھ تھا بیچ منگوایا — کھانا اس کے لیئے میں پکوایا

کتنا کھانا بیاں کروں تجھ سے — جس پہ سو مہماں کروں تجھ سے

مجھ سے تھی روزگار سے ان بن — خوب کھانا تو تجھ پہ ہے روشن

چار من گاجروں کا قلیہ تھا — وہ منی دیگ بیچ دلیا تھا

روٹیاں کس قدر بتاؤں میں — جس کو دو چار سال کھاؤں میں

چاہ کر کے گرا وہ بلا[4] ع — ہر دو روح اشعب[5] طمّاع

تھے ابھی روٹیوں کے جیب کے حبیث — میں رہا کہتا کھا گیا وہ سمیٹ

[1] ایک کھانا جو چاولوں میں گوشت ڈالکر پکایا جاتا ہے پھرا۔ [2] ...۔ [4] بُھر کریں۔ [3] ناخنوں سے چھیل کر یعنی چباتے ۔ [5] نگل جانے والا۔

کھانا کوئی اور کیا کھیے اس کا	سارے منھ دیکھتے رہے اُس کا
جب مرے گا وہ بھوک کا روگی	روح توشے کی روٹی میں ہو گی
کھانے کی بو جو ناک میں پیٹھے	مرگیا ہووے تو بھی اُٹھ بیٹھے
عقل باور اگرچہ کرتی نہیں	وہ مرے بھوک اس کی مرتی نہیں
بھوکے اس کا جو جی نکل جاوے	گور میں بھی کفن نگل جاوے

مرغ بازی

(۲۶)

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرچہ پر خاش مرغ یاں آئے
پر و پرزا درست و یکساں ہے — مرغ تصویر کا بھی حیراں ہے
مرغ ہے ایک ایک جیسے کلنگ — قاز و سارس سے جنگجو کا ننگ
حوصلہ کس قدر ہو[۱] اصل کا — ذکر کیا کرس شتر دل کا
لات کی گھات کر جو مڑ جاوے — نسر[۲] طائر کا رنگ اُڑ جاوے
لات مارے جو کاٹ کر حلقوم — حیدرآباد تک پڑی ہے دھوم
ٹینی کے سر پہ آج ٹیکا ہے — اس کے آگے گنیل[۳] پھیکا ہے
کب ہیں پیلے سے مرغ زریں بال — حسن لاکھے کا سمجھے مرغ خیال
کر سکے وصف مرغ کیا کوئی — مرغ[۴] آمین کو دعا گوئی
مرغ کا مرغ ہووے مرغ انداز — مرغ ایسا ہو تو بجا ہے ناز
یعنی اپنا حریف جب پاوے — پر ہلانے نہ دیوے کھا جاوے
سینہ کیا سینہ بال کیا پر و بال — جیسے چشم[۵] خروس آنکھیں لال
اور جو سُست ہو ہوا تھیلا — دونوں بازو کے پر دیئے پھیلا
دم سے کیا ہو یہ بیدم و مجروح — قصد پرواز میں تھا مرغ روح
مرغ قبلہ نما کو وحشت ہے — بال کھولے ہیں پر نہ طاقت ہے
ورنہ اُڑ کر کہیں چلا جاتا — دیر اپنے مقام پر آتا
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش — جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ کی ایک پرفشانی ہے — ان کی صد رنگ بدزبانی ہے

[۱] ایک بی جانور [۲] ایک ستارہ جس کو عقاب بھی کہتے ہیں [۳] خاردار [۴] پیلے مرغ جیسے [۵] آمین کہنے والا فرشتہ اس کے لیے دعا مانگتا ہے [۶] کنکھجی

جھجکتے ہیں آپ کو چراتے ہیں — لاتیں گویا کہ یہ بھی کھاتے ہیں

ایک کے منھ میں مرغ کی منقار — ایک کے لب پہ ناخنِ گفتار

منھ میں آیا جو کچھ سو بکنے لگے — ٹیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے

طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے — بعدِ نصف النہار رخصت ہے

بوزنہ

(۲۸)

بوزنہ یا کوئی تحفہ دہر کا
عزت افزا ئندہ تھا اس شہر کا

ربط اسے جس سے ہی اس سے ربط ہی
مار کھانے پر بھی اس کو ضبط ہی

لیکن اس جاگہ تو صادق ہی یہ قول
سارے اسکے آدمی کے سے ہیں ڈول

ہی تماشا آئنہ کے روبرو
عکس سے اپنے اسے ہی گفتگو

دیکھنا جھاک جھک کے اس کا ہو نہ ضبط
آدمی بندر کا ہی مشہور ربط

جان دیں بندر اگر دیکھیں چنے
رہتے ہیں چاول پڑے اس کے کنے

موہنی بلّی

۲۹

ایک بلّی موہنی تھا اس کا نام
اُن نے میرے گھر کیا آکر مقام

ایک ڈوّے ہو گئی اُلفت گزیں
کم بہت جانے لگی اُٹھ کر کہیں

ربط پھر پیدا کیا میرے بھی ساتھ
دیکھتی رہنے لگی میرا ہی ہاتھ

حاملہ ہو کر کئی بچّے دیے
ایک ڈو بھی سو نہ اُن میں سے جیے

متصل ایسا ہوا جو اتفاق
مرگ ان بچّوں کی گزری بہت شاق

حفظ اس کی کوکھ کا لازم ہوا
جھاڑے پھونکے کا ہر اک عازم ہوا

پانچ بچے ان نے اس نوبت دیے
بارے سب وے قدرتِ حق سے جیے

اپنی ماں کے رات دن سینے لگے
پانچوں بچّے دودھ کچھ پینے لگے

کوئی کُتّا آگیا ایدھر اگر
لوگ دوڑے شیر سے منھ پھاڑ کر

ڈر سے [۱] بغلیں سب ہوئیں یاروں کی گرم
زرد زرد اُن کی دُمیں منھ نرم نرم

لچھے ریشم کے سے چندیں رنگ خال
کچھ سفید و کچھ سیہ کچھ زرد و لال

نکلتی تھیں جدھر یہ پانچ چار
وہ طرف ہو جاتی تھی باغ و بہار

ایک عالم عاشق و بیتاب تھا
ان کی خاطر بےخور و بےخواب تھا

گِرد رو [۲] باندھو تو چہرہ حور کا
چاندنی میں ہو تو بکّا نور کا

گرمِ شوخی ہو اگر یہ مثلِ برق
بجلی میں اس میں نہ کچھ کر سکیے فرق

پاپری اس پردہ میں ہی جلوہ گر
اُٹھتی اودھر سے نہیں ہرگز نظر

داغ گلزاری سے اس کی تازہ باغ
اس زمانِ تیرہ کی چشم و چراغ

کیا دماغ اعلیٰ طبیعت کیا نفیس
کیا مصاحب بے بدل کیسے جلیس

یہ نفاست یہ لطافت یہ تمیز
آنکھ [۳] دوری بھی نہ ہو کیسی ہی چیز

نوٹ: ۱ بغلوں میں لے لیا ۲ گول چہرہ ۳ چہرے سے دور رکھنا تو درکنار آنکھ سے دور رکھنے کو جی نہ چاہے۔

کتیا اور بلاؤ کی دوستی

(۳۰)

سگ و گربہ ہیں دو ہمارے ہاں
دو ہیں قالب اور ان کی اک ہی جاں

رنگ گربہ سے شیر نر ہے داغ
آنکھیں اس کی اندھیرے گھر کا چراغ

کھائے نہ جو نہ ہو وہ مادۂ سگ
ہو کا بیٹھا رہے قیامت لگ

کب مروت سے جائے کھانا چکھ
لڑتے ہے بھی تو پنجہ منھ پر رکھ

سارے ہمسایوں پر ہے یہ معلوم
موش کی نسل ہو گئی معدوم

چوہا کیا ہے جو سامنے آوے
گھونسوں سے بھی یہ شیر بھڑ جاوے

ان نے جو ماریاں ہیں گھونسیں دھونس
موشِ دشتی ہوا ہے کونے گھونس

گھونس جب فکر ہی میں مرتی ہو
موشِ دشتی پہ کیا گزرتی ہو

کوئی چھچھوندر جو بستی میں یاں ہے
سو وہ چوہوں کی مرثیہ خواں ہے

ایک دن گھر میں ایک گھونس آئی
اپنے پاؤں اجل اسے لائی

گھونس کیسی بتاؤں غیرت موش
طاق ہے جس کے آگے طاقتِ موش

یا کوئی مادہ خوک آبستن
یا کسو کچھوے کی برادر زن

پھرتی پھرتی جو صحن میں خوشحال
پائے دیوار بیٹھی سر کو نکال

کہیں ودھر یہ شیر جاتا تھا
پھیرتا منھ پہ پنجے آتا تھا

پڑ گئی اس کی اس پہ چشم کبود
نیلا پیلا ہوتا وکھا جوں دود

پنجہ جھنجلا کے ان نے گزرانا
بارے کچھ گھونس نے اُسے جانا

پر اسے خوف جاں نہ آیا کچھ
غالب آیا نہ اس کا سایا کچھ

ٹھکٹھکا یا پھر ان نے جا تالو
کیونکہ تھا یہ تو شیر کا خالو

ے ایک قسم کا گرگچھ جسے خوک آبی کہتے ہیں۔

پھر تو بگڑی ہی دونوں میں آکر
چوٹ ہوتی ہی داؤ پا پا کر

غصّہ خرگوش کو بھی آن چڑھا
اتفاق اُس جگہ تھا ایک گڑھا

دونوں لڑتے ہوئے گرے اس میں
گیج کو گاہتے پھرے اس میں

ناخن اس شیر کا کچھ ایک گڑا
شورِ محشر گڑھے کے بیچ پڑا

شور کیسا محلّے چونک اُٹھے
سگ بازاری بھونک بھونک اُٹھے

یاں تو گھر بیچ کیا ہی کیا ہی پڑی
گھونس بلّی نے چھیڑ سے کر دی

کھڑی مونچھوں کے بال انگڑاتا
شیر نکلا گڑھے سے گھبراتا

لیک جی سے تھا سب بدن خالی
کیونکے سر سے بلا بڑی ٹالی

گھونس کے وارثوں کی کیا ہی تاب
کہ قدم کو رکھیں وہ حتی الباب[لہ]

کوئی پچھوندر اب اس پہ روتی ہی
کہ تری لاش خوار ہوتی ہی

تو جو تھی ساری قوم کی سردار
سو اُٹھایا ہی زخمِ دامن دار

ہم بہت غم میں تیرے رووینگے
بِل کے بِل اب خراب ہووینگے

فخر ہی اپنی نسل کا یہ شیر
جن نے گھونسوں کے کر دکھائے ڈھیر

سُنا ہی موش گربہ کا قصّہ
وہ جو ہی گا عبید کا حصّہ

جس کو باندھا عبید زاکانی
لگتی تھی اس کی وہ سگی نانی

قطعہ

گربہ تا بود فاسق و فاجر
صید او یک بُدے بسالانہ

ایں زماں پنج پنج مے گیرد
کہ شدہ مومن و مسلمانا

لہ دروازے تک۔

مادہ سگ

(۳۱)

ہی جو وہ مادہ سگ تماشا ہی ۔ دوڑ پڑنے کے وقت باشا[۵۱] ہی
کسی کے لقمے پہ نہ منہ ڈالا ۔ سگِ اصحابِ کہف کی خالا
نہیں کتیوں سی خوار یاں کی یہ ۔ ہی سگوں میں عزیز خاں کی یہ
وے ہرن کو بھی جلدی میں ہنتا ۔ ہی گایاں سگ لوند[۵۲] کیا کتا
اُڑتی چڑیا انھیں نے ماری ہی ۔ استخوانِ سگِ شکاری ہی
یہ جو غصے میں آوے تو ہی غضب ۔ اس کے مارے ہوے ہیں ہار سب
منہ میں دیتے ہیں اس کے جب شُل ۔ طرفہ دم لابہ[۵۳] کرتی ہی اپیل
منہ میں اپنے لیے فتیلے سے ۔ سگ لیلیٰ کے ہی قبیلے سے
باہم اس بلی سے کتے کا یہ ربط ۔ کوئی دیکھے نہ ہووے اس سے ضبط
کبھو جاتا جو ہی یہ کوٹھے پہ ۔ لگی رہتی ہی اس کی چھت سے نظر
اور سے دشمنی جانی ہی ۔ اس کی یہ باؤلی دوانی ہی

۵۱ ایک شکاری پرند

۵۲ بدمعاش

۵۳ دُم ہلانا

خروس

(۳۲)

کئی برس سے ہمارے کنے تھا ایک خروس
خروس عرش کی اولاد سے ولے فسوس

پھرا جو اُس سے یکا یک زمانۂ کج باز
قضا نے اس کو کیا ایک بار مرغ انداز

دیا کرے وہ اذاں دونوں وقت صبح و شام
بجا ہے مرغ مصلےٰ رکھیں گر اس کا نام

نہیں ہے مرغ چمن میں جہاں کے ایسا آج
برنگ کلّہ تاجِ خروس سر پہ تاج

جو بیٹھے جھانپے میں پرداز[۵۱] پر سے مرغِ خیال
کھڑا ہو دھوپ میں تو رشکِ مرغِ زریں بال

کبھو جو صحن میں گھر کے وہ اشرف الطیار
پھرا ہے کیس کو ڈالے تو مرغ آتش خوار

نہ پیچ[۵۲] خفتہ ہیں تناگستری میں اس کی مدام
بزرگداشت کریں مرغ سبزوار تمام

رہا ہمیشہ سے وہ مرغ مستعدِ جنگ
طرف نہ اس کے ہوئے بچ گئے ہیں قاز و کلنگ

جب اُن نے گانٹھ کے اک لات حلق پر ماری
شتر دلی کی شتر مرغ نے کئی باری

نہ اس کے سامنے کوئی کھڑا رہا مرغا
حواصل[۵۳] اس سے بگڑتا تو تھا وہ کیا مرغا

بجز کنارہ نہ سیمرغ کو بنا چارہ
کہ فیل مرغ کو بکری کی طرح سے مارا

ہمیشہ گربہ و سگ سے بھی روک ٹوک اسے
جہاں سے لے گئی آخر یہ نوک جھوک اسے

خصومت اس کی تھی بیک ماوہ سگ سے شام و سحر
کبھو وہ لات اسے مارتا کبھو شہپر

قضا جو پہنچی تھی نزدیک وہ بھی جھنجلائی
حریف ہو کے دلیرانہ سامنے آئی

یہ بے تہیا[۵۴] تھا نہ سمجھا ادا کو سینے کی
لگائی سامنے ہوتے ہی ایک سینے کی

ہلائی ان نے بھی گردن لگی کہیں بے کل
کہ ایک دم میں گئی آہ گردن اُس کی ڈھل

جھکا جو خاک کی جانب تو کیں بے جاں کا
زمیں پہ تاج گرا ہدہدِ سلیماں کا

ہوا کے مرغ ہوئے داغ اُس کے ماتم سے
سیاہ پوش رہے طایرِ حرم غم سے

۵۱؎ ساخت کی نرزونی ۵۲؎ پیچ ۵۳؎ ایک آبی پرند ۵۴؎ خودرائے، بیوقوف

وہاں جو نوحۂ مرغانِ قدس باز ہوا کہ مرغِ قبلہ نما کا بھی دل گداز ہوا

قفس کے مرغ نے سن ترک آب و دانہ کیا طیور نے بھی نہ پھر قصدِ آشیانہ کیا

ہوا ز بس کہ پراگندہ یہ غمِ جاں سوز اُداس رہنے لگے سارے مرغِ دست آموز

خروس عرش ہی اس بن نہیں ہے سینہ فگار ہزار مرغ[۵] کا اب گھر خروس پہ ہے بار

زمانہ جب تئیں ہے اس کے درد کے مارے رہیں گے خاک فشاں مرغِ خانگی سارے

خموش میر تجھی کو نہیں یہ رنج و تعب
کباب آتشِ غم میں ہیں مرغ و ماہی سب

تمام شد

۵۔ بلبل ہزار داستان کا ہونا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔